اقبالی مجرم: مرتبہ جناب شورش کاشمیری کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، متوسط تقطیع،

قیمت تحریر نہیں، پتہ: ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور، (پاکستان)

آغا شورش کاشمیری مرحوم علامہ اقبال کے پرستار اور انکے افکار و خیالات کے پرجوش مبلغ تھے اسلئے اقبال کے نکتہ چین اور غلط ترجمان اُن کے قلم کا خاص نشانہ تھے، اس کتاب میں انھوں نے اقبال سے متعلق عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال کے ان حصوں کی تردید کی ہے جن میں اقبال کو قادیانیت کے معاملہ میں نرم ثابت کیا گیا ہے، پھر عابد علی عابد مرحوم کی شعر اقبال کے بعض مندرجات کی تردید کرکے بتایا ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کا اصل سرچشمہ قرآنی تعلیمات ہیں آخر میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی فکر اقبال کا تجزیہ کرکے یہ لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب نے فکر اقبال کے بنیادی عناصر کو نظرانداز کرکے اقبال کے طائر فکر کو اپنے بال و پر دینے کی کوشش کی ہے، شروع میں اقبال سے متعلق پاکستانی مطبوعات اور وہاں انکے نام پر قائم کیے گئے اداروں کے اقبال کے افکار و نظریات کو توڑ موڑ کر شائع کرنے پر آہ و فغاں کی ہے، اور ان کو صحیح خطوط پر کام کرنے کا مشورہ دیا ہے،

مثنوی زہر عشق - مرتبہ - جناب امیر حسن نورانی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی

صفحات ۸۰ قیمت، عام اڈیشن ۸ عہ پیسے خاص اڈیشن ۶ عہ پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

اردو کی جن مثنویوں کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ان میں ایک نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق بھی ہے جو اپنی سادگی و سلاست، حلاوت و روانی، سوز و گداز اور روزمرہ اور محاوروں کی صفائی کے لحاظ سے بے مثال خیال کیجاتی ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے، اور اسکی خصوصیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے عرصہ سے کمیاب تھی، اس لیے لائق مرتب نے اسکو مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں شوق کے حالات، شاعری اور صنف مثنوی پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد زہر عشق کے زمانۂ تصنیف کی تعیین اس کے اہم مطبوعہ نسخوں، مآخذ، قصہ و کردار اور خصوصیات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، مقدمہ میں کہیں کہیں شوق اور انکی مثنویوں کے بارہ میں بعض غلط بیانات کی تردید بھی کی گئی ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۹ ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ عدد ۳

مضامین

شذرات

دارالمصنفین اور معارف کے حلقہ میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے، وہ معارف کی مجلسِ ادارت کے رکن اور دارالمصنفین کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر تھے، رفیق کی حیثیت سے بھی کئی سال تک یہاں رہ چکے تھے اور تصنیف و تالیف کے علاوہ سیرۃ النبی کی نظرِ ثانی میں بھی انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہاتھ بٹایا تھا، سید صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں اُن کی صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا، تعلیم سے فراغت کے کچھ ہی عرصہ بعد اُن کو دارالمصنفین لے آئے، تصنیف و تالیف کے علاوہ وہ اُن کی درسی لیاقت کے بھی معترف تھے، قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق انھیں شروع ہی سے تھا، سید صاحب کی صحبت میں یہ ذوق اور بڑھا، یوں تو سبھی اہم تفسیریں نظر سے گذری تھیں لیکن ابن جریر اور ابن کثیر سے زیادہ دلچسپی تھی علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے تو عاشق تھے، اُن کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے، اسی گرویدگی کا اثر تھا کہ مختلف کتابوں سے اُن کے تفسیری بیانات چن کر ایک ضخیم کتاب تیار کر دی، اُن کی یہ کوشش ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں،

علمی انہماک کے ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کا بھی بڑا خیال تھا، اُن کا خاندان شریعت و طریقت کی جامعیت میں ممتاز تھا، اُن کے پردادا مولانا عبدالعلی حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے سلسلہ سے وابستہ تھے، دادا مولانا محمد ادریس بھی ایک بڑے عالم اور شیخِ طریقت تھے، وہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا عبدالحق حقانی، اور قاری عبدالرحمن پانی پتی کے شاگرد اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے، والد ماجد مولانا محمد انیس بھی پوری زندگی ارشاد و ہدایت میں مصروف رہے، اس خاندان کی بدولت اودھ کے بہت سے علاقوں میں کتاب و سنت کی روشنی پہنچی، دیہات کی بہت سی برادریاں جو شرک و بدعت اور غیر شرعی رسوم میں مبتلا تھیں اُن کے ذریعہ راہ راست پر آئیں، مولانا محمد اویس کو تعلیمی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے دیہاتی حلقوں میں دورہ کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا لیکن باین ہمہ بزرگوں کی یہ روایت منقطع نہیں ہونے پائی،

دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں ندوہ کو اُن کی ضرورت محسوس ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ندوہ کے بھی معتمد تھے، چنانچہ اُن کے مشورہ سے وہ وہاں چلے گئے، اور قرآن مجید کی تعلیم اُن کے سپرد ہوئی، خدا داد مناسبت کے علاوہ سید صاحب کی رہنمائی میں وہ اس موضوع پر کافی تیاری کر چکے تھے، اس لئے اُن کا درس بہت مقبول ہوا، طلبہ کے علاوہ لکھنؤ کے تعلیم یافتہ اصحاب نے بھی استفادہ کی خواہش کی، اور سید صدیق حسن صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر درس ہونے لگا، یہ سلسلہ جب تک بیماری نے مجبور نہیں کر دیا، برابر جاری رہا، اُن کو قلبی تکلیف کئی سال سے تھی لیکن شروع میں اس کا احساس نہیں ہوا لیکن جب تکلیف بڑھی، تو علاج شروع ہوا، اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی لیکن تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر نہ چل سکی، بالآخر وقتِ موعود آپہونچا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور پسماندگان کو توفیق عطا فرمائے کہ اُن کے نقشِ قدم کو دلیلِ راہ بنائیں،

قرآن مجید کے ترجمے بہت ہوئے، اور ہو رہے ہیں لیکن شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ اور تفسیری فوائد (موضح القرآن) کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہو سکی، سوا سو برس میں اردو کا اسلوب بہت بدل گیا ہے لیکن شاہ صاحب کا ترجمہ اب بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اہلِ مطابع نے کتابت و طباعت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی، جس کی وجہ سے اغلاط میں اضافہ ہوتا رہا، اس صورتِ حال کو مولانا اخلاق حسین قاسمی نے محسوس کیا، اور بڑی محنت سے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ وہ اس کی

اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں، امید ہے کہ صاحبانِ استطاعت اس کارِ خیر میں اُن کی مدد کر کے دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں اجرِ عظیم حاصل کریں گے،

ہر سال عربی اور فارسی کے ممتاز عالموں کو صدر جمہوریۂ ہند اعزاز عطا کرتے ہیں، گزشتہ سال پٹنہ کے پروفیسر سید حسن صاحب کو یہ اعزاز عطا ہوا تھا، امسال وہیں کے پروفیسر اقبال حسین اور شاہ عز الدین ندوی پھلواروی کو یہ اعزاز ملا ہے، پروفیسر سید حسن صاحب دار المصنفین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اور اسکی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں، اُن کے علمی کارنامے ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ہند کے اصحابِ علم سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، شاہ عز الدین ندوی بھی دار المصنفین کے قدرداں اور اس کے کارکنوں سے مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں، انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، علوم اسلامیہ کے ساتھ عربی ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں، طالب علمی ہی کے زمانہ میں عربی تحریر و تقریر میں انھیں امتیاز حاصل تھا، الازہر جیسے بلند پایہ مصری رسالہ میں ان کا تحقیقی مضمون شائع ہوا تھا، بعد کو دار العلوم ندوۃ العلماء، مدرسۂ شمس الہدیٰ اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ پٹنہ میں انھوں نے عربی زبان اور اسلامی علوم کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، پروفیسر اقبال حسین کی علمی اور تعلیمی خدمات بھی اہلِ علم کے حلقہ میں بنظرِ تحسین دیکھی جاتی ہیں، ہم ان سب اصحاب کو مبارکباد دیتے ہیں،

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو شروع ہی سے جامعہ میں ایک عالی شان مسجد کی تعمیر کا خیال تھا، لیکن نامساعد حالات کی بنا پر عرصہ تک یہ خیال عمل کا قالب اختیار نہ کر سکا، ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے دوستوں نے اُن کی آرزو کو بر لانے کی کوشش کی، تعمیر مسجد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے سکریٹری سعید انصاری صاحب مقرر ہوئے، حیدرآباد کے مشہور آرکیٹکٹ فیاض الدین صاحب نے نقشہ بنایا، اور مشکلات کے باوجود اللہ نے چند سال میں ایسی وسیع اور خوبصورت عمارت تعمیر کرا دی جسے دیکھ کر لوگ قصر الحمرا اور جامع قرطبہ کو یاد کرنے لگے،[1] اللہ سے دعا ہے کہ اس مسجد کی آبادی کا بھی شایانِ شان انتظام فرما دے، تاکہ حسنِ ظاہر پر حسنِ باطن کا اضافہ نورٌ علیٰ نور ہو جائے،

---

[1] ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین ۷ جون ۱۹۷۶ء مضمون الفریڈ جے ایڈون، (ALFRED. J. EDWIN)

مقالات

افغانستان میں آٹھ روز

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

شیخ الاسلام خواجہ ابو اسمٰعیل عبد اللہ انصاری ہروی جنھیں لوگ پیرِ ہرات، اور پیر انصار بھی کہتے ہیں، قرنِ پنجم ہجری کے نامور ترین علمائے دین، صوفیائے کرام اور عرفائے عظام میں شمار ہوتے ہیں، اُن کی شخصیت کے چند در چند پہلو ہیں، وہ محدث و مفسر بھی ہیں اور شیخ طریقت و رہبر شریعت بھی، وہ ادیب سخنور بھی ہیں، اور روحانی پیشوا بھی، انھوں نے ابو سعید ابی الخیر میہنوی اور ابو الحسن خرقانی جیسے عارفان بزرگ سے اکتسابِ فیض کیا تھا، اور خود ان کے حلقۂ رشد و ہدایت میں ابو الحسن باخرزی اور ابو القاسم زوزنی ایسے علما شامل تھے، خواجہ عبد اللہ حنبلی مسلک کے پیرو تھے، اور اہل بدعت کے سخت ترین مخالف، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ حدیث و تفسیر کی تدریس و تفہیم اور معتزلیوں، اشعریوں اور متکلمین کے خلاف معارضہ و مبارزہ میں گزرا، اسی وجہ سے انھیں اپنی زندگی میں بڑی مصیبتیں سہنی پڑیں، انکا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا پر آشوب تھا، اگرچہ پیرِ ہرات نے اپنے کو سیاست سے برکنار

رکھا، لیکن عقائد میں سخت گیری اور تعصب کی بنا پر ان کے مخالفین برابر اُن کے خلاف سازشیں کرتے رہے، اور تہمت لگاکر دو بار انھیں ہرات سے تبعید اور ایک بار قید پابزنجیر کرانے میں کامیاب ہوگئے، اگرچہ وطن سے دوری اور قید و بند کی مدتیں بہت ہی مختصر رہیں۔

خواجہ عبداللہ کی ولادت ہرات میں ۲ شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) کو ہوئی تھی اور وفات ۲۲ ذی الحجہ ۴۸۱ھ کو، انکے والد خواجہ ابومنصور بھی ہرات کے رہنے والے تھے، اُن کا سلسلۂ نسب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و معروف صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، خواجہ عبداللہ نے سلطان محمود غزنوی سے لیکر سلجوقی فرمانروا ملک شاہ تک کا زمانہ دیکھا تھا، اُن کے علم و فضل کے پیش نظر خلیفۂ عباسی مقتدی باللہ نے انھیں ۱۰۸۳ء میں شیخ الاسلام کا لقب عطا کیا، پیر انصار نے کئی متعدد تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں زیادہ تر ملفوظات کی حیثیت رکھتی ہیں، بایں معنی کہ وہ منبر سے جو تقریر کرتے اسے ان کے شاگرد اور مرید تحریر کر لیتے تھے، آثار پیر ہرات میں مناجات سب سے زیادہ مشہور رہے، لیکن اُن کی سب سے اہم تالیفات کشف الاسرار و عدۃ الابرار، منازل السائرین، اور طبقات الصوفیہ ہیں، اول الذکر قرآن کریم کی تفسیر ہے، جسے اُن کے شاگرد ابوالفضل رشید الدین المیبدی نے املا اور توسیع کرکے مرتب کیا، منازل السائرین میں ان سو منزلوں کی تشریح کی گئی ہے جو سالک طریقت کو طے کرنی ہوتی ہیں، طبقات الصوفیہ سلمی کی ہمنام کتاب کا املا باضافہ ہے، یہ املا ہرات کی مقامی زبان میں تھا، اسے جامی نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی بنیاد پر اپنی مشہور کتاب "نفحات الانس" مرتب کی۔

۱۹۶۲ء میں خواجہ عبداللہ کی وفات کی صد سالہ برسی افغانستان میں منائی گئی تھی، ایک یادگار تقریب میں شیخ الاسلام کے احوال و آثار کے متعلق افغانستان اور بعض دوسرے

ملکوں کے اسکالروں نے گرانقدر مقالے پڑھے تھے۔ امسال یعنی ۱۳۹۶ھ میں افغانستان کی وزارت اطلاعات و کلتور (کلچر۔ ثقافت) کی طرف سے پیر ہرات کے ہزارویں سال تولد کی مناسبت سے ایک یادگاری جشن منعقد کیا گیا جس میں شرکت کے لیے مختلف ملکوں کے نمایندوں کو دعوت دی گئی تھی، ثقافتی روابط کی بھارتی کونسل (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز) نے گزشتہ ماہ نومبر میں مجھے اپنا نمایندہ بنانے کی پیشکش کی تھی جسے میں نے بڑی مسرت اور شکریے کے ساتھ منظور کر لیا تھا، سیر و سیاحت کا شوق مجھے ہمیشہ آمادہ بسفر رکھتا ہے، کسی غیر ملک کی سیاحت کا موقع اگر مل جائے تو اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، پھر افغانستان کی سیر کا خیال ہی ولولہ انگیز تھا، کیونکہ اس قدیم ملک سے ہمارا بڑا گہرا سیاسی، تہذیبی اور ادبی رشتہ ہے، خصوصاً فارسی زبان و ادب کا تو یہ ملک گہوارہ رہا ہے، فارسی پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہوگی کہ انھیں ایران، افغانستان اور ترکستان کی سیر و سیاحت کا موقع میسر ہو، میں نے ایران کو دو بار دیکھا ہے اب افغانستان دیکھنے کی باری آئی تھی۔

کابل میں شیخ الاسلام پیر انصار کی ہزارویں سالگرہ ولادت کی تقریب کی تاریخیں ۲۸ اپریل سے ۲ مئی تک مقرر کی گئی تھیں، بیرونی ممالک کے نمایندوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ۲۰ اپریل تک کابل پہنچ جائیں، اسی اعتبار سے I.C.C.R کی سینیر پروگرام آفیسر مسز اوشا ملک نے مجھے ہدایت دی تھی کہ میں ۲۰ اپریل کو دہلی سے کابل کے لیے روانہ ہو جاؤں، لیکن عجب اتفاق کہ ۱۴ اپریل سے میں ایک اذیت ناک مرض ہرپیز (Herpes) میں مبتلا ہو گیا، جس میں بائیں سینے اور بازو پر آبلہ نما دانے نکل آتے ہیں اور ان میں بڑی سوزش ہوتی ہے، میں نے علاج کی طرف فوری توجہ کی، اسکے باوجود

مرض کی شدت کم ہوتے ہوتے دس دن لگ گئے، جلد اتنی ذکی الحس ہوگئی کہ باریک سے باریک کپڑا بھی پہننا محال تھا، اسی اثناء میں ۲۰ اپریل کو I.C.C.R. والوں نے پٹنہ سے دہلی اور دہلی سے کابل تک کی رفت و آمد کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ، اور سرکاری پاسپورٹ مع ویزا اور پندرہ پونڈ کے زرمبادلہ کے لیے ریزرو بنک کا اجازت نامہ بھیج دیا اور یہ ہدایت کی کہ میں ۲۴ اپریل کو دہلی پہنچ جاؤں تاکہ وہاں سے ۲۷ کو کابل کے لیے پرواز کرسکوں، میں نے اپنی بیماری کا حال لکھ کر اُن سے یہ درخواست کی کہ میں پٹنہ سے ۲۸ کو اور دہلی سے کابل کے لیے ۲۹ کو روانہ ہو سکتا ہوں، انھوں نے میرے پروگرام کی اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا، اور ۲۶ اپریل کو بذریعہ فون اطلاع دی کہ آج دہلی آجاؤ ورنہ یہ سفر ملتوی کرنا پڑے گا، ۲۷ اپریل کی صبح کو میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر پروگرام کی تبدیلی پر راضی کر لیا اور اسی دن بذریعہ طیارہ دہلی کو پرواز کیا، پٹنہ سے دہلی کا سفر ہوائی جہاز سے ڈھائی گھنٹے کا ہے، کیونکہ راستے میں طیارہ لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر نصف ساعت کے لیے توقف کرتا ہے، اور وہاں سے بھی مسافر سوار ہوتے ہیں، ہم پانچ بجے بعد عصر دہلی پہنچ گئے۔

دوسرے دن میں نے مسز اوشا ملک سے ملاقات کرکے اپنے آنے اور کابل کے سفر کے واسطے تیار رہنے کی اطلاع دی، انھوں نے آریانا افغان ایرلائنس والوں سے فون پر گفتگو کرکے میرے لیے ۲۹ اپریل کی پرواز میں ایک سیٹ محفوظ کرالی چنانچہ ۲۹ کو میں شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر محمد ادریس کے ساتھ ایک بجے پالم ایرپورٹ پہنچ گیا، کیونکہ کابل کے لیے طیارہ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو پرواز کرنے والا تھا، دہلی شہر میں زرمبادلہ حاصل کرنے میں دہلی کالج کے ڈاکٹر محمد یوسف نے بڑی مدد کی،

پالم ایرپورٹ پر ڈاکٹر محمد ادریس کی وجہ سے اسباب وزن کرانے اور فاضل تین پونڈ زرمبادلہ حاصل کرنے میں خاصی آسانی ہوئی، لیکن افغانی طیارہ تین گھنٹے تاخیر سے آیا اس لیے ہمیں اس کے انتظار کی خاصی زحمت برداشت کرنا پڑی، ادریس صاحب پانچ بجے تک میرے ساتھ رہے، اس کے بعد میں نے انھیں اور زیادہ تکلیف دینا پسند نہیں کیا اور رخصت کر دیا، کسٹمس اور سیکوریٹی چکنگ کے بعد سب مسافر لانج میں چلے آئے، اور یہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے ہمیں طیارہ کی پرواز تک بیٹھنا پڑا، آخر سات بجے شام کے قریب ہمیں طیارہ میں سوار ہونے کی ہدایت ملی اور ہم سوار ہو کر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، طیارہ میں کوئی سوا سو مسافر ہوں گے، ان میں سے متعدد ایران اور انگلستان جانے والے تھے، آریانا افغان ایرلائنس کے کرایے کی شرح دوسری ہوائی کمپنیوں کی بہ نسبت قدرے کم ہے اس لیے بعض مسافر لندن جانے کے لئے افغانی طیارے سے سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، ہمارے طیارے نے ساڑھے سات بجے پرواز کی، میری سیٹ کے دونوں پہلوؤں پر دو نوجوان تھے، ایک تہران جا رہا تھا دوسرا کابل کو، یہ دونوں انگلشین تھے، ہوائی جہاز میں شراب نسبتہً سستی ملتی ہے، کیونکہ یہاں ڈیوٹی نہیں لگتی ہے، دونوں نوجوانوں نے شراب کی ایک ایک بوتل خرید لی اور جام پر جام چڑھانا شروع کر دیا، میری جان بڑی ضیق میں تھی، رات ہو چکی تھی، کھڑکی سے جھانک کر فضا کے تغیرات کو دیکھنا بھی ممکن نہ تھا خدا خدا کر کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کابل شہر کی روشنیاں دکھائی دیں اور یہ اعلان کیا گیا کہ جہاز کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے، طیارہ سے اترنے کے وقت میں نے سویٹر پہن لیا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ کابل میں ابھی سردی ختم نہیں ہوئی ہے، اور اس وقت باہر میدان میں سرد ہوا چل رہی ہے، اب مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ معلوم نہیں ہوائی اڈے پر

کوئی میری مدد کو آیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں آیا تو اجنبی جگہ میں رات کے وقت کہاں مارا مارا
پھروں گا، مسٹر اوشا ملک نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ہندوستانی سفارت خانے کو میرے
سفر کابل کے متعلق تار سے اطلاع دے دی گئی ہے، لیکن تار وقت پر پہنچا یا نہیں اس کا
یقین نہیں تھا، اسی تردد میں ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوا، دروازے ہی پر
ایک شخص نے بڑھ کر مجھ سے سوال کیا آپ پروفیسر سید حسن ہیں؟ میں نے ہاں کہا تو انھوں
نے اپنا تعارف کرایا، یہ تھے ہندوستانی سفارت خانے کے کلچرل اتاشی جناب عزالدین
عثمانی۔ انھوں نے ایک افغانی جوان عورت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ خانم
شیریں تاج ہیں جو شعبۂ تشریفات کی جانب سے آپ کی مہماندار ہیں، اور اس وقت
آپ کو ساتھ لے کر ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل جائیں گی جہاں آپ کی اقامت کا انتظام ہے،
اور جہاں اسوقت وزیر اطلاعات و کلتور (کلچر) افغانستان کی طرف سے مہمانوں کو ڈنر
دیا جا رہا ہے، آپ کا وہاں انتظار ہو رہا ہے۔ خانم شیریں تاج نے میرا پاسپورٹ اور
دیگر کاغذات سفر لے کر میرا اسباب ڈھونڈ کر نکالا، پھر کسٹمس کے معاملات طے کیے،
اس کے بعد ہم تینوں ایک کار میں (جو خاص میری آمد و رفت کے لیے مقرر کر دی
گئی تھی) بیٹھ کر ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل پہنچے۔ مجھے تیسری منزل پر کمرہ ملا تھا، اس کمرے
میں پہنچ کر میں نے جلد جلد لباس تبدیل کیا، اور پھر نیچے آ گیا، عثمانی صاحب اور شیریں تاج
دونوں میرے انتظار میں تھے، میں دونوں کے ساتھ ہوٹل کے ڈائنس ہال میں گیا،
جہاں ڈنر ہو رہا تھا، اس وقت ہندوستانی گھڑی کے مطابق رات کے دس بجے تھے،
لیکن افغانستان کا وقت ہندوستانی وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے، یعنی یہاں نو کا
وقت ہو رہا تھا۔ ڈنر تقریباً ختم ہو چکا تھا، عثمانی صاحب نے وہاں مجھے کئی

مہمانوں سے ملایا، جن میں کچھ تو ہمارے سفارت خانے کے کارمند تھے، کچھ افغانی اور کچھ
باہر سے آئے ہوئے اسکالر، یہاں ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی بھی موجود تھے، جو ہندوستان
میں ایرانی رایزن فرہنگی یعنی کلچرل کاؤنسلر ہیں، یہ مجھ سے دو دن پہلے ہی دہلی سے آ گئے تھے،
ڈاکٹر حسین خدیو جم بھی ملے، جو کابل میں ایرانی کلچرل کاؤنسلر اور ایک مہینہ قبل
ہندوستان آتے تھے، ان سے پٹنہ میں خدا بخش لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی، وہ امام
غزالی کی تالیفات کے متعلق تحقیقات میں مشغول ہیں، اور اسی سلسلے میں پٹنہ آئے
تھے، افغانستان کے مشہور و معروف محقق رضا مائل ہروی سے بھی ملاقات ہو گئی، جو
چار سال قبل تحقیقی کام سے پٹنہ آئے تھے، اور چند دن میرے مہمان رہے تھے، خانم
شیریں تاج مجھے اس کمرے میں لے گئیں، جہاں کھانا چنا ہوا تھا، اور اصرار کیا کہ میں کچھ
کھاؤں، لیکن مجھے بھوک نہیں تھی، اس لیے کہ طیارہ میں ہمیں کھانے کو مل چکا تھا،
ان کے اصرار سے میں نے تھوڑے چاول اور کچھ آلو کی ترکاری کھائی اگرچہ کھانے کو بہت سی
چیزیں موجود تھیں، لیکن میں انھیں پہچانتا نہ تھا، پھر میں اس میز پر آ کر بیٹھ گیا جہاں ڈاکٹر
مجتبائی بیٹھے تھے، اب افغانستانی موسیقی کا پروگرام شروع ہوا، ہال کے ایک طرف
چبوترہ سا بنا ہوا تھا، اس پر آٹھ دس سازندے کرسیوں پر افغانی لباس پہنے آ کر بیٹھے
ان کے ہاتھوں میں سارنگی، ستار، طبلہ، بانسری، ڈھول کے قسم کے آلاتِ
موسیقی تھے، پھر بغل کے کمرے سے ایک مغنیہ نکل کر ڈائس پر آ گئی، اس نے ایک
ہاتھ میں مائکروفون کا سرا لے لیا، اور گانا شروع کیا، سازندوں نے بھی اپنے
ساز پر اس کا ساتھ دیا، لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مغنیہ کا نام مہوش
ہے، اور یہ افغانستان کی مشہور گانے والی ہے، اس نے تقریباً آدھ گھنٹے تک پشتو

اور فارسی غزلیں گائیں، اس کے بعد ایک دوسری مغنیہ آئی جس کا نام فسانہ تھا، اس نے بھی نصف ساعت تک گانے سنائے پھر تیسری گانے والی آئی جس کا نام تھا رخسانہ، اور اس کے بعد قمر گل نے غزلیں سنائیں، بیچ میں ایک نوجوان مرد نے بھی کچھ گانے سنائے، اس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں، گانے کا یہ پروگرام تقریباً دو گھنٹے تک چلتا رہا، اس کے بعد سب مہمان رخصت ہونے لگے، میں بھی ہال سے نکل کر باہر آیا، عثمانی صاحب اور شیریں تاج دونوں رخصت ہوئے، چلتے وقت شیریں تاج یہ کہہ گئیں کہ میں کل صبح ۹ بجے تیار ہو کر نیچے ہوٹل کے لانج میں آ جاؤں، وہ کار لے کر آئیں گی اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور نماز عشا کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگا، کمرے میں بستر لگی ہوئی دو مسہریاں تھیں، ایک پر لیٹ گیا، نیند تو جلد آ گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد سردی محسوس ہونے سے آنکھ کھل گئی، میں نے پائنتی رکھا ہوا کمبل اوڑھ لیا، لیکن یہ کافی نہ ہوا، اور دوسرا کمبل بھی جو دوسری مسہری پر تھا اُسے بھی ملا کر اوڑھنا پڑا،

دوسری صبح کو میں نے کمرے اور ہوٹل کے ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کیا، اس میں ضروری سامان یعنی میزوں کرسیوں، کپڑا رکھنے کی الماری کے علاوہ صابن، تولیہ، خط لکھنے کا کاغذ، لفافے، نوٹ بک، ریڈیو اور ٹیلیفون موجود تھے، اس کمرے کی وضع قطع اور فرنیچر تقریباً اسی طرح کے تھے، جو میں نے ایران کے ہوٹل آریا شیراتون میں دیکھے تھے، جہاں میں ۱۹۰۳ء میں ابوریحان البیرونی کی ہزارویں سالگرہ کے جشن میں شرکت کرنے کے موقع پر ٹھہرا تھا، صرف ایک چیز کم تھی یعنی ٹیلیویژن، تہران کے ہوٹل میں ٹیلیویژن بھی موجود تھا، کمرے کے ایک طرف شیشے کی دیوار تھی، اس کے پردے کو ہٹا کر دیکھا تو سامنے نشیب میں چند عمارتیں نظر آئیں، اور کوئی آبادی

دکھائی نہیں دی، البتہ دور پہاڑوں کا سلسلہ تھا، جن کی چوٹیاں برف آلود تھیں، اصل میں یہ ہوٹل شہر سے باہر ایک بلند ٹیلے پر بنا ہوا ہے، یہاں سے جو سڑک نیچے کو جاتی ہے وہ عام شاہراہ سے مل جاتی ہے۔

ماحول کا جائزہ لینے کے بعد میں نے گھر کے لوگوں کو اپنے بخیریت کابل پہنچ جانے کی اطلاع دینے کو خط لکھ ڈالا اور اُسے لیے ہوئے نیچے لانج میں آیا، دفتر پذیرائی سے یہ معلوم ہوا کہ ڈاک خانہ زمین دوز کمرے میں ہے، لیکن آج جمعہ کا دن ہے اس لیے تعطیل ہے، ایران کی طرح افغانستان میں بھی جمعہ کے دن تعطیل ہوتی ہے، اب چائے ناشتہ کی فکر ہوئی، میری مہماندار خانم شیریں تاج نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں بتائی تھی کہ صبح کی چائے کہاں ملے گی، وہ تو ۹ نو بجے آنے کو کہہ گئی تھیں، اور اس وقت صرف سات بجے تھے، آخر دفتر پذیرائی کے ملازم سے دریافت کرنا پڑا کہ چائے ناشتہ کہاں ملے گا، اس نے لفٹ کے قریب ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا، میں اس میں داخل ہوا تو اندر ایک بڑا ڈائننگ ہال دکھائی دیا، جس میں ہوٹل کے کئی یورپین مرد و عورت میزوں پر چائے نوشی میں مشغول تھے وہیں میں بھی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا، ہال کے ایک گوشے میں ناشتہ کی چیزیں، از قسم ٹوسٹ، روٹی، کیک، مکھن، پنیر وغیرہ رکھے تھے، لوگ خود وہاں جا کر حسب خواہش چیزیں لے کر میز پر چلے آتے تھے میں نے بھی یہی کیا، دو ٹوسٹ اور ایک کیک لے کر چلا آیا، ہوٹل کے بیرے نے مکھن اور مارملیڈ لا کر میرے سامنے رکھ دیا پھر چائے لے آیا، کھانے کے بعد بیرا بل لے کر آیا جس میں ٹکسو افغانی کی رقم لکھی تھی، میں نے بل پر دستخط کر دیئے اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ یہ رقم مجھے اپنی جیب سے دینا ہوگی یا ہمارے میزبان ادا کریں گے، بعد میں معلوم ہوا کہ مہمانوں کے

...... کھانے کے بل حکومت کی طرف سے ادا کئے جائیں گے لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ ناشتہ اور کھانے کے لیے کیا رقم مقرر کی گئی ہے۔ ایران میں جشن سالگرہ البیرونی کے موقع پر مہمانوں کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ ناشتہ کے واسطے چودہ تومان (= ۱۲ روپئے) اور کھانے کے لیے ۴۳ تومان (= ۳۰ روپیہ) کی رقمیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ہوٹل کا مینو (کھانوں کی فہرست) دیکھ کر اتنی رقموں کی چیزیں منگوا کر کھا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ رقم کا اگر بل ہو تو فاضل رقم جیب خاص سے ادا کرنا ہوگی، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے کسی وقت بھی مقررہ رقم سے فاضل کی نہیں بلکہ اس سے بہت کم کی چیزیں کھائیں

ناشتہ ختم کرنے کے بعد میں ہوٹل کے لانج میں آگیا اور یہاں بیٹھ کر خانم شیریں تاج کا انتظار کرنے لگا۔ لانج میں اور بھی کئی مہمان بیٹھے تھے۔ جن میں زیادہ تر یوروپین یا امریکی تھے، اس ہوٹل کے مالک امریکی ہیں۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس قسم کے ہوٹل دنیا کے اکثر بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ پونے نو ۹ بجے خانم تاج آگئیں اور ہم دونوں چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق وزارت اطلاعات وکلتور کے کتاب خانے میں مخطوطات کی ایک نمائش دیکھنے چلے، نو بجتے بجتے ہم وہاں پہنچ گئے، اور بھی بہت سے مہمان آ گئے تھے، یہاں افغانی اور بیرونی اسکالروں سے ملاقات ہوئی اور آپس میں تعارف ہوا، وزیر اطلاعات بھی موجود تھے، شروع میں کتاب خانہ کے ڈائرکٹر جناب صدیقی نے کتاب خانے کے انتظامی امور پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ یہاں چند ہزار مخطوطات موجود ہیں جن میں سے بعض بہت ہی نادر و نفیس ہیں۔ پھر فرانس کے اسکالر، مسٹر ڈبورکوئی نے ریشمی فیتہ کاٹ کر نمائش کا افتتاح کیا چونکہ اس نمائش کا خواجہ عبداللہ انصاری کے ہزارویں سال ولادت کی مناسبت سے

اہتمام کیا گیا تھا۔ اس لیے اس میں نمایاں مقام خواجہ کی تالیفات کو دیا گیا تھا، مناجات اور الٰہی نامہ کے متعدد نسخے تھے، جن میں بعض بہت ہی قدیم و نادر و نفیس تھے، قرآن پاک کے بھی کم از کم پندرہ مخطوطات تھے، جن میں سے ایک کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا اور ایک دوسرا حضرت حسن رضؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ کئی شعرائے فارسی کے دیوانوں کے بھی خطی نسخے نمائش میں رکھے گئے تھے۔ ایک عمدہ مذہب و مطلا بڑی تقطیع کا مخطوطہ کلیات مرزا عبدالقادر بیدل کا بھی دیکھا، جو ۱۲۸۲ — ۱۲۹۲ ہجری کا لکھا ہوا ہے، چونکہ وقت کم تھا، اور ایک دوسری نمائش کو بھی دیکھنے کا پروگرام تھا، اس لیے ان مخطوطات کو مفصل طور پر دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

اس کتابخانے سے ہم لوگ کابل ننداری، پہنچے جس کی عمارت کے طبقہ فوقانی میں خواجہ ابو عبداللہ انصاری کے احوال زندگانی سے متعلق تصویروں کی نمائش تھی، نمائش کا افتتاح جناب غلام رسول یوسفی وکیل ریاست باختر اژانس نے کیا، اور تصویروں کی تشریح ڈاکٹر عبدالغفور روان فرہادی نے کی، یہاں مہمانوں کو چائے بھی پلائی گئی۔

نمائشوں کے دیکھنے کا پروگرام بارہ بجے ختم ہوگیا، دوپہر کے کھانے کی دعوت والی کابل یعنی کابل کے گورنر کی طرف سے باغ بالا کے رستوران میں ایک بجے تھی، جس کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس وقفے میں خانم تاج نے تجویز کیا کہ ہم شہر کے بعض علاقوں کی سیر کر آئیں، چنانچہ کار میں بیٹھ کر ہم دونوں شہر کے بعض محلوں سے گزرتے ہوئے پارک زرنگار میں پہنچے یہ پارک خاص شہر کے باہر واقع ہے، بہت ہی پرفضا اور کشادہ ہے، یہاں عموماً اہل شہر دوپہر کو سیر کے لیے آتے ہیں، لیکن ہم نے

وہاں بہت کم آدمیوں کو پایا، اس پارک کے ایک کنارے بلندی پر امیر عبدالرحمان کا مقبرہ
ہے، اور ایک خوبصورت مکان بھی ہے، تھوڑی دیر تک پارک میں گھومنے کے بعد ہم
واپس ہوئے اور راستے میں کابل یونیورسٹی اور جمال الدین افغانی کی یادگار دیکھتے آئے،
جمعہ کی وجہ سے یونیورسٹی بند تھی اس لیے اندر جانے کا موقع نہ مل سکا راہ میں کئی مسجدیں
دیکھیں اور مسجد جامع کے پاس سے بھی گزرے، لیکن ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا تھا اسلیے
مسجدوں میں سناٹا تھا، میری خواہش ہوئی کہ میں جمعہ کی نماز ادا کروں اور یہاں نماز پڑھنے
والوں کی تعداد اور حالات کا اندازہ کروں، لیکن افسوس کہ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ہم
باغ بالا میں ایک بجے پہنچ گئے، ارادہ یہ تھا کہ کھانے کے بعد فوراً کسی مسجد کو چلے چلیں گے،
لیکن وہاں دیر تک کھانے کے انتظار میں بیٹھنا پڑا، معلوم نہیں کہ خانم تاج کار لے کر کہاں
چلی گئیں کھانے میں دیر دیکھ کر کہیں کام سے چلی گئی ہوں گی یہ جگہ مسجدوں سے بہت دور
بھی تھی پھر اجنبی شہر میں پیادہ نہ کوئی سواری اور نہ کوئی رہنما، مجبوراً مسجد جانے کا خیال ترک
کر دینا پڑا۔

باغ بالا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک بلندی پر واقع ہے، پہلے یہاں امیر عبدالرحمٰن
کا محل تھا، جہاں وہ گرمیاں گزارنے آتے تھے، اب اس عمارت میں ایک رستوران
ہے یہاں سے نیچے کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے، انگور کے باغات بھی ہیں،
لیکن ان دنوں اس پھل کا موسم نہ تھا، سب لوگ رستوران کے برآمدے میں دیر تک
کھانے کے انتظار میں بیٹھے رہے، تقریباً دو بجے کے بعد کھانا شروع ہوا، ضیافت
پر تکلف تھی، تین قسم کا پلاؤ، کشمش پلاؤ، مرغ پلاؤ، اور سادہ پلاؤ، مرغ کا گوشت
گوسفند کے کئی قسم کے گوشت اور کباب، گوسفند کا بچہ پورا بھنا ہوا کھانے میں بہت ہی

نرم اور لذیذ۔ یہ افغانستان کی مشہور چیز ہے،
میٹھی چیزوں میں دو طرح کی پڈنگ تھی، سب سے آخر میں نارنگی اور پرتگال
(یعنی مالٹا)، اس زمانے میں اور کوئی پھل از قسم سردا اور انگور دستیاب نہیں ہوتے،
کھانا تقریباً تین بجے ختم ہوا اس کے بعد استالیف کو جانے کا پروگرام تھا، چنانچہ موٹروں
کا ایک قافلہ ہوٹل سے نکل کر استالیف کی طرف روانہ ہوا، کابل سے باہر نکل کر
ہم کچھ دور تک شاہراہ پر چلتے رہے پھر نسبتاً کمتر درجے کی سڑک پر ہو لیے یہ سڑک
نشیب و فراز طے کرتی اور پہاڑوں کا چکر کاٹتی تقریباً ایک گھنٹے میں بلندی پر بنی ہوئی
ایک خوشنما عمارت کے پاس جا کر ختم ہو گئی۔ یہ استالیف کا مہمان خانہ تھا، استالیف
کابل سے تقریباً پچاس کیلومیٹر اتر ایک چھوٹا سا قصبہ ہندوکش پہاڑوں کے درمیان
واقع ہے، اور عمدہ آب و ہوا، اور خوبصورت قدرتی مناظر کے لیے سیاحوں کی دلچسپی
کا باعث ہے، یہاں شہنشاہ بابر نے ایک باغ لگوایا تھا جو اب بھی موجود ہے مہمان خانے کے صحن سے
جو اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے ہم نے چاروں طرف نگاہ ڈالی واقعی یہ بہت ہی خوبصورت مقام ہے سامنے برفیلی چوٹیوں
والی پہاڑیاں ڈھلوان پر چنار اور سفیدار کے بلند و بالا اشجار، ان کے درمیان
ایک جوئے نغمہ خواں رواں ہے، کناروں پر گل ارغوان کے خوشنما
اور نازک پودے، مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانے پر کشمیر کا مشہور مقام
پہل گام ہے، ہم تھوڑی دیر تک اس پر فضا حسین منظر کو اپنی آنکھوں میں سموتے
رہے، پھر مہمان خانے میں چائے کا دور چلا اتنے میں سرد ہوا بہنے لگی اور مجھے خاصی
ٹھنڈک محسوس ہوئی، اور لوگوں کو بھی ہوا کی اس تبدیلی کا احساس ہوا اور
ہم لوگ واپس چلنے کے لیے موٹروں میں سوار ہو گئے، استالیف کے بازار کو دیکھنے

پروگرام تھا۔ یہ بازار اگرچہ چھوٹا ہے مگر ایک قصبے کے لیے بہت ہی دلکش ہے، اسٹرک کے کنارے دو رویہ دکانیں ہیں جن میں مقامی دستکاری کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں، یہاں کی خاص صنعت مٹی کے برتنوں پر روغن چڑھانا ہے، چنانچہ روغنی برتنوں کی متعدد دکانیں ہیں، اس کے علاوہ چاندی کے بنے ہوئے زیورات، زر کے تاروں یا ریشمی تاگوں کے کام کئے ہوئے پوستین و پوستینچہ، ٹوپیاں اور عورتوں کے واسطے ہینڈ بیگ سے دکانیں سجی ہوئی تھیں، سیاحوں کے لیے سفر کی یادگار چیزوں کے خریدنے کی اچھی جگہ ہے، ہم لوگ تھوڑی دیر تک دوکانوں کو دیکھ کر کابل واپس آچلے، راستے میں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے بچے گل ارغوان اور گل لالہ کے گلدستے لیے کھڑے تھے ہم لوگوں کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے، ایک گلدستہ گل لالہ کا اس قدر دلفریب تھا کہ ہماری مہماندار نے اُسے خرید لیا،

ہم لوگ ساڑھے سات بجے کے قریب کابل لوٹے، رات کا کھانا تالار محمود طرزی کے ڈائننگ ہال میں تھا، محمود طرزی ہال، افغانستان کے مشہور قوم پرست رہنما محمود طرزی کے نام پر ہے، یہاں پریس کلب بھی ہے، اور کانفرنس روم بھی، کھانا تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو ختم ہوا، اور سب لوگ اپنی جائے اقامت کو چلے گئے۔

دوسرے دن نو بجے سے سمنار شروع ہوا۔ سمنار کے جلسے تالار محمود طرزی کے کانفرنس ہال میں ہوتے تھے، اچھا خاصا بڑا ہال ہے، بیچ میں ڈائس ہے، اور اسکے سامنے اور دونوں پہلوؤں میں میزیں اور کرسیاں ہیں جو بیضاوی شکل میں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر میز پر مائکروفون اور آلۂ سماعت لگے ہوئے ہیں جس کو بولنا ہوتا ہے وہ اپنی کرسی پر بیٹھے کو مائک پر بولتا ہے، اگر کسی کی آواز دھیمی ہے تو کانوں پر

آلۂ سماعت لگا لینے سے اُس کی بات صاف سنائی دیتی ہے، سمنار کے اجلاس دو وقت ہوتے تھے، پہلا اجلاس ۹ بجے سے ایک بجے تک بیچ میں چائے نوشی کے لیے نیم ساعت کا وقفہ۔ ایک بجے سے ۲½ بجے تک دوپہر کا کھانا دوسرا اجلاس ۲½ بجے سے ۵½ بجے تک، بیچ میں نصف ساعت کا وقفہ چائے نوشی کے لیے ہر جلسے کا صدر کسی بیرونی اسکالر کو منتخب کیا جاتا تھا، ایک افغانی اسکالر نائب صدر اور سکریٹری ایک افغانی جناب محمد آصف فکرت تھے، مقالہ کی زبان فارسی مقرر کی گئی تھی، ہر مقالہ کی سائکلو اسٹائل کاپیاں شرکاے جلسہ کو تقسیم کردی جاتی تھیں، جو اسکالر فارسی میں مقالہ نہیں لکھ سکے تھے، ان کے مقالے کو بھی فارسی میں ترجمہ کرکے اس کی کاپیاں بانٹ دی جاتی تھیں، البتہ سویڈن کے ایک اسکالر ڈاکٹر بو اتاس نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا، اس کا فارسی ترجمہ بروقت نہیں ہوسکا۔ ہر مقالے پر حاضرین اظہار رائے بھی کرتے تھے، بعض مرتبہ تو یہ اظہار رائے بحث کی شکل اختیار کر لیتا تھا، چنانچہ عراقی نمائندے ڈاکٹر عبد الامیر اعثم کے مقالے پر جو خواجہ عبد اللہ انصاری اور حنبلی عقائد کے متعلق تھا بڑی طویل بحث ہوئی۔ ہر جلسے میں پانچ یا چھ مقالے پڑھے گئے جن بیرونی اسکالروں نے اس سمنار میں حصہ لیا اُن کے نام یہ ہیں، روس سے ڈاکٹر انتقینا گرسیموا (یہ خاتون پشتو زبان کی ماہر ہیں) ایران سے ڈاکٹر جمال رضائی، ڈاکٹر حسین خدیوجم، ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی، ڈاکٹر خطیب رہبر، اور ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، عراق سے ڈاکٹر اعثم اور ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، سویڈن سے ڈاکٹر بو اتاس، امریکہ سے ڈاکٹر لاید کلفٹن میلر، فرانس سے مسٹر ڈیبورکوئی اور پروفیسر روزی ارتالدتر، افغانستان کے تقریباً تیس اسکالروں نے مقالہ خوانی میں حصہ لیا، جن میں سے جناب عبد الحی حبیبی

جناب عبدالوہاب محمود طرزی، استاد صالح پروفتا، استاد علی اصغر شیر، جناب رضا مائل ہروی، جناب رحیم الہام، ڈاکٹر سید مخدوم رہیں، ڈاکٹر روان فرہادی، ڈاکٹر امیر محمد اثیر، جناب عبداللہ خدمتگار، اور ڈاکٹر محمد یعقوب واحدی کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ سمنار میں جو مقالے پڑھے گیے ان میں سے بعض کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) علامہ انصاری۔ محیط فکری منابع در روش بحث وی در کتاب ذم الکلام (مقالہ نگار، دکتر اکرم ضیاء العمری)

(۲) پایداری خواجہ عبداللہ انصاری در راہ عقیدہ (محمد علم غواص)

(۳) خداشناسی وخودشناسی در مناجات پیر ہرات (ڈاکٹر عبدالحکیم ضیائی)

(۴) عارفان مفسر قران کریم ومقام خواجہ انصاری در میان ایشان (پروفیسر غلام حسن مجددی)

(۵) پیام پیر ہرات بہ جہان امروز (پروفیسر ڈاکٹر بہاء الدین مجروح)

(۶) پیر ہرات در آثار امیر علی شیر نوائی (ڈاکٹر محمد یعقوب واحدی)

(۷) تاثیر آثار پیر ہرات بر آثار حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل (ڈاکٹر امیر محمد اثیر)

(۸) مردم شناخت پیر ہرات (رضا مایل ہروی)

(۹) خاندان پیر ہرات (استاد علی اصغر بشیر)

(۱۰) نثر مسجع در سخن پیر ہرات (ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی)

(۱۱) معنی توحید در تصوف پیر ہرات (پروفیسر روژہ آرنالدز)

(۱۲) شخصیت روحانی وخدمات عرفانی حضرت خواجہ انصاری (مولوی عبدالغنی علمی)

میں نے پڑھنے کے لائق اب تک کوئی مقالہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اپریل کے شروع میں پروفیسر عبدالحی حبیبی کی ایڈٹ کردہ طبقات الصوفیہ اور رسائل مناجات والہی نامہ کے مطالعہ سے ایک مقالے کا خاکہ تیار کر لیا تھا، اور ارادہ تھا کہ افغانستان روانہ ہونے سے پہلے پورا مقالہ مکمل کر لوں گا، لیکن میں ۱۴ اپریل سے بیمار ہو گیا جس کا تذکرہ اس مضمون کے شروع میں کر چکا ہوں، لہذا ایک غیر مکمل سا مضمون لکھ کر ساتھ لیتا آیا تھا۔ کابل پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سب لوگوں کو میرے مقالے سے دلچسپی ہے۔ افغانستان میں ہندوستان کے سفیر جناب کے آر پی سنگھ کی ملاقات کو گیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ میں کون سا مضمون کس زبان مین پڑھوں گا، جناب عثمانی صاحب نے بھی یہی سوال کیا، میری مہمان داگ مس تاج بھی برابر یہی سوال کرتی تھیں، سمنار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فرہادی بھی بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں اپنا مقالہ کب پڑھوں گا، اور اس کا کیا عنوان ہے، میں ہندوستان کا واحد نمائندہ تھا، اور مجھے اپنا اور اپنے ملک کا وقار قائم رکھنا تھا، اس لحاظ سے مجھ پر بڑی ذمہ داری تھی، میں نے ICCR والوں سے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں مقالہ پڑھوں گا اس شرط کو بھی پورا کرنا تھا، آخر میں نے اپنا مقالہ مرتب ومکمل کر لیا، اور ڈاکٹر فرہادی کو بتا دیا کہ میں۔ اجلاس کے تیسرے روز صبح کی نشست میں اپنا مقالہ پڑھوں گا جس کا عنوان ہے۔ "سخنانی چند در بارۂ نفوذ وتاثیر افکار خواجہ عبداللہ انصاری" چنانچہ مقررہ نشست میں جس کی صدارت روسی نمایندہ ڈاکٹر الفتینا گرایسمو دا کر رہی تھیں مقالہ پڑھنے کے لیے میرا نام پکارا گیا اور میرے سامنے رکھے ہوئے مائکروفون میں روشنی ہو گئی، میں نے مقالہ پڑھنا شروع کیا اور تقریباً بارہ۱۲، پندرہ منٹ میں اسے ختم کر ڈالا، چند لمحے تک سناٹا سا رہا،

پھر جناب عبد اللہ خدمت گار نے اظہار رائے کے لیے لب کشائی کی۔ مقالے پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس کی تعریف کی اور اس میں بعض جو نئی باتیں تھیں ان کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی۔ کسی اور اسکالر نے میرے مقالے پر تبصرہ نہیں کیا، البتہ اجلاس کے خاتمے پر جناب علی اصغر بشیر اور ڈاکٹر عبد الوہاب محمود طرزی مجھ سے ملنے آئے۔ مقدم الذکر نے مجھ سے خواجہ الطاف حسین حالی کے بارے میں مزید معلومات طلب کیں جنھیں میں نے خواجہ عبد اللہ انصاری کی اولاد میں بتایا تھا، جناب طرزی نے حکیم ناصر خسرو کے متعلق حالی کے اس مقدمے کے بارے میں سوالات کیے جس کا میں نے مقالے میں حوالہ دیا تھا، ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی اور ڈاکٹر روان فرہادی نے میرے مقالے کی تعریف کی ہندوستانی سفارت خانے سے عثمانی صاحب آج مخصوص میرا مقالہ سننے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بھی اظہار خوشی کیا کہ میرا مقالہ بہت اچھا تھا۔ ان لوگوں کے تعریف کرنے سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ میں ایک بڑی ذمہ داری سے بطور احسن عہدہ برآ ہوا۔ اجلاس برخاست ہونے سے قبل سارے شرکاے جلسہ نے مجھے اتفاق رائے سے دوسری نشست کا صدر منتخب کر لیا تھا چنانچہ سہ پہر کو جو اجلاس ہوا اس کی صدارت کے فرائض میں نے انجام دیے، اور یہ کام بھی بخوبی انجام پایا۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر روان فرہادی نے کہا کہ آپ نے مقالہ بھی اچھا پڑھا اور صدارت بھی اچھی طرح کی۔

مئی کی چوتھی تاریخ کو ہم لوگوں کے ہرات جانے کا پروگرام تھا، کیونکہ وہ حضرت خواجہ انصاری کا مولد و مدفن ہے، اور اس تقریب کے موقع پر اس شہر کی زیارت ضروری تھی، چنانچہ ہم لوگ نو بجے ہوائی اڈے پر جا پہنچے، جہاں باختر کمپنی کے دو طیارے ہماری مسافرت کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ یہ دونوں طیارے چھوٹے سائز کے تھے، اور ایک میں صرف

تیس مسافروں کی گنجائش ہے، اور ہم چالیس آدمی تھے، اس لیے دو طیاروں کی ضرورت ہوگی، باختر کمپنی کے طیارے اندرون ملک مواصلات کے لیے مقرر ہیں۔ ہمارے طیارے میں ۲۰ آدمی تھے، یہ طیارہ زیادہ بلندی پر پرواز نہیں کر رہا تھا، اس لیے ہم زمین پر کی چیزوں کا دھندلا نظارہ کر سکتے تھے، ہمارے نیچے پہاڑ ہی پہاڑ تھے، جن میں سے اکثر کی چوٹیاں برف پوش تھیں، جہاں پہاڑ نہیں تھے وہ جگہ اجاڑ معلوم ہوتی تھی، ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم ہرات پہنچ گئے، یہاں صوبہ ہرات کے گورنر جناب غلام علی آئین، ان کے اسٹاف کے لوگ، دیگر حکام شہر اور علما و فضلاے ہرات ہماری پیشوائی کو موجود تھے، جہاز سے اتر کر ہم لوگ ان کی صف میں سلام اور مصافحہ کرنے کو داخل ہوئے، ہم پر پھولوں کی بارش کی گئی، پھر ہم موٹروں میں سوار ہو کر شہر کو روانہ ہوئے، ہوائی اڈے سے شہر تک تقریباً بیس کیلومیٹر کا فاصلہ ہے، لیکن سڑک پختہ کشادہ اور سیدھی ہے اس کے دونوں طرف چنار اور سفیدار کے بلند و بالا درخت لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے خیابان کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، ایک جگہ سڑک ہری رود، ندی کو پل کے ذریعے عبور کرتی ہے، یہ ندی بہت چوڑی نہیں ہے، لیکن بظاہر گہری معلوم ہوئی، اور اس کا پانی تیزی سے بہ رہا تھا، نصف ساعت کے بعد ہم شہر میں داخل ہوئے جہاں ہماری اقامت کا انتظام کیا گیا تھا، اور ہمارے لیے کمرے محفوظ کر لیے گئے تھے، ہم لوگ مختصر سامان کے ساتھ آئے تھے جسے کمروں میں رکھ کر اور منہ ہاتھ دھو کر پھر ہوٹل کے باہر جمع ہوئے کیونکہ ہمیں تالار ولایت (یعنی گورنر کے آفس کے کانفرنس ہال) کو جانا تھا، جہاں گورنر اور اہالی شہر کی طرف سے ہماری پذیرائی کا اہتمام کیا گیا تھا، چنانچہ ہم لوگ پھر موٹروں میں سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے، مسٹر آئین کے علاوہ ان کے اسٹاف کے عملے، پولیس اور فوج کے بڑے بڑے افسر اور

شیوخِ شہر بڑی تعداد میں موجود تھے، یہاں بھی ہمارے سروں پر گلاب کی خوشبو پنکھڑیوں کی بارش کی گئی، تقریب کا آغاز قرآن پاک کی چند آیتوں کی تلاوت سے ہوا، پھر افغانستان کا قومی ترانہ گایا گیا، اس کے بعد مسٹر آئین نے ایک مختصر اسپیچ میں خواجہ عبد اللہ انصاری کی شخصیت کا تذکرہ کیا، جشن کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا، ہرات میں شعبۂ اطلاعات وکلتور کے سربراہ جناب عبد الوحید نافذ نے بھی مہمانوں کے خیر مقدم کے لیے مختصر سی تقریر کی، مہمانوں کی طرف سے ڈاکٹر سرژبور کوئی اور پروفیسر عبد الحی حبیبی نے شکریہ ادا کیا، آخر میں خواجہ انصاری کی مناجات کے چند جملے بڑی خوش الحانی کے ساتھ سنائے گئے، اس تقریب کے اختتام کے بعد ہرات کے تاریخی مقامات اور مزارات کے دیکھنے کا پروگرام تھا۔

ہرات کابل سے ۵۰ کیلو میٹر دور شمال مغرب میں ایران کی سرحد کے قریب مشہور ومعروف قدیم شہر ہے۔ سکندر کے حملوں سے پہلے یہاں پر ارتھکانا نام کا ایک شہر آباد تھا، سکندر نے اسی مقام پر ہرات کا شہر بسایا، اور ایک مضبوط قلعہ بنوایا، یہ قلعہ اب نیست ونابود ہو چکا ہے، لیکن حصار ہنوز شکستہ حالت میں قائم ہے، ہری رود ندی چکر کھاتی ہوئی اس شہر کے مختلف نقاط سے گزرتی ہے، یہاں کی آب وہوا نہایت خوشگوار و فرحت بخش ہے، آس پاس کے علاقوں میں پھلوں کے باغات اور پھولوں کے چمنستان ہیں، یہاں سے کچھ دور بادغیس کا مشہور قصبہ ہے جہاں بخارا کا سامانی فرمانروا سلطان نصر بن احمد بغرض تفرج وتفریح آیا تھا، لیکن اس کی فرحت فزا آب وہوا اور پھولوں اور پھلوں کی رنگا رنگی اور خوش مزگی میں ایسا محو ہوا کہ پایۂ تخت کو لوٹنا بھول گیا، اور عرصے تک یہاں رہ گیا، اس کا قصہ نظامی عروضی

تفصیل کے ساتھ چہار مقالہ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح رودکی نے اپنا مشہور قصیدہ خوش الحانی سے گا کر بادشاہ کو فوراً بخارا لوٹ چلنے پر آمادہ کیا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس کا بیٹا مسعود غزنوی ہرات کا گورنر تھا اس شہر پر ترکوں اور تاتاریوں نے بار بار حملے کئے، اور ہرات اُجڑ اُجڑ کر بستا رہا، تیموری بادشاہوں کے زمانے میں اسے بڑا عروج حاصل ہوا، خصوصاً تیمور کے بیٹے، اور جانشین شاہرخ مرزا نے اس شہر کو اپنا پائے تخت بنا کر اس کی تزئین وآراستگی پر بڑی توجہ صرف کی، اس کی بیوی گوہر شاد بھی عمارات بنوانے کا بڑا ذوق رکھتی تھی، سلطان حسین بایقرا اور اس کے علم دوست ومعارف پرور وزیر امیر علی شیر نوائی کے زمانے میں ہرات دانشمندوں اور ہنرمندوں کا مجمع تھا، یہاں شاعر وسخنور بھی تھے نامور محدث ومفسر بھی، فقیہ ومعلم بھی، صوفی وعارف بھی، مورخ وطبیب بھی، مصور ومعمار بھی، بہزاد ایسا مصور اسی زمانے میں یہاں پیدا ہوا، ان سب کو امیر علی شیر نوائی کی سرپرستی حاصل تھی، سامانی اور غزنوی بادشاہوں، اور ان کے وزیروں نے یہاں خوبصورت باغ لگوائے، اور عمارتیں بنوائی تھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی اور خواص وعوام کے لیے قابل دید ہیں۔ (اس شہر کی تاریخ وتوصیف کے لیے معین الدین زمچی اسفزازی کی مشہور تالیف روضات الجنات فی اوصاف مدینۃ الہرات ملاحظہ ہو)

راقم السطور نے ۱۹۵۷ء میں ہرات کے ایک فارسی شاعر اور خواجہ حافظ شیرازی کے ہمزمان وہم دربار رکن صاین ہروی کا دیوان مرتب ومحشی کر کے طبع کرایا تھا، اس وقت سے دل میں ہرات دیکھنے کی تمنا تھی۔ اب جو وہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی تو عجیب کیفیت سے دوچار تھا، خدا کا شکر بجا لایا کہ اس نے میری قسمت میں اس شہر کی زیارت لکھ دی تھی ورنہ

خواب میں بھی اس کی امید نہیں کرسکتا تھا، اپنی قسمت کی یاوری پر حیرت ہوتی تھی کہ کہاں میں اور کہاں ہرات کا دیدار۔

اب ہم قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کو دیکھنے چلے، سب سے پہلے ہرات کے محلے کہن دژ (حصار قدیمی) پہنچے جو خواجہ انصاری کی جائے ولادت ہے، یہاں وہ اپنے والد کے گھر میں پیدا ہوئے تھے، وہ مکان زیر زمین ہوگیا تھا اس کا صرف اوپر کا حصہ نظر آتا تھا، اندر جانے کا راستہ زمین دوز ہے۔ اب اسے زمین کھود کر باہر نکالا گیا ہے، یہ مکان ایک پرفضا وشاداب باغ میں واقع ہے۔ نزدیک ہی امام زادہ ابوالقاسم محمد بن جعفر صادق رضی کا مزار ہے۔ حضرت ابوالقاسم خلیفہ عباسی ہارون رشید کے زمانے میں خفیہ طور پر خراسان میں رہتے تھے۔ ہرات ہی میں وفات پائی یا بروایتے دیگر شہید ہوئے خواجہ انصاری برابر اس مزار کی زیارت کیا کرتے تھے، مزار کی قدیم عمارت اور اس کا گنبد خراب ہوچکا تھا، جس کی مرمت ۱۳۲۵ ہجری میں کی گئی، اور پھر بعد میں اس کے مدخل کے ایوان کو کاشی کاری سے مزین کیا گیا ہے، کہن دژ ہی میں سید عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار کا مزار بھی ہے، جو سال ۱۳۴ ہجری میں شہید ہوئے تھے، ان کے مقبرے کا گنبد ۱۰۶۰ھ ہجری میں تعمیر ہوا تھا، اور سلطان حسین بایقرا کے عہد میں اس کی مرمت وکاشی کاری ہوئی ہے۔ گنبد کے اندر اس کے آٹھ رواقوں کی مقرنس کاری قابل دید ہے، اسے اسلامی ہنر کے نفیس نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مقبرے کے مشرقی رواق میں صاحب[1] کتاب نزہتہ الارواح وطرب المجالس اور محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کے سوالات کے طرح کنندہ کا مزار ہے، امیر حسینی سادات خواجہ عبداللہ انصاری کے عقیدت مندوں میں سے تھے، اس گنبد کے اندر چند اور

---

[1] امیر حسن سادات متوفی ۷۱۸ھ۔

قبریں ہیں، ایک قبر میرناصر عرب کی ہے، جس کے بڑے سنگی صندوق پر شمشیر و تفنگ وکلاہ خود اور سپر کے نقوش بنے ہوئے ہیں۔

یہاں سے نکل کر ہم لوگ خواجہ عبداللہ انصاری کے استاد ابوعبداللہ محمد بن فضل طاقی سجستانی ہروی کے مقبرے کی زیارت کو گئے ابوعبداللہ محمد جو خواجہ طاقی کے نام سے مشہور ہیں۔ علوم شریعت و طریقت میں درجہ کمال رکھتے تھے، شیخ الاسلام خواجہ انصاری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "و پیر من است واستاد من واگر او رانمی دیدم اعتقاد حنبلیان نمی دانستم" خواجہ طاقی سال ۴۱۶ھ میں فوت ہوئے تھے، ان کا مقبرہ شہر کے جنوب میں واقع ہے، شاہرخ مرزا نے ان کی تربت پر ایک بلند وبالا عمارت تعمیر کرادی تھی لیکن مرور ایام سے وہ اب باقی نہیں رہی۔

دوپہر کا وقت ہوگیا تھا، اور ناظر ولایت میں والی ہرات کی طرف سے چاشت یعنی لنچ کی دعوت تھی، چنانچہ ہم لوگ وہاں ڈیڑھ بجے جا پہنچے۔ دعوت میں تقریباً وہی سب چیزیں تھیں جو ہم لوگ کابل کی دعوتوں میں کھا چکے تھے، تین قسم کا پلاؤ، مرغ اور گوسفند کا گوشت، کباب، سلاد، روٹی، پڈنگ، پھلوں میں نارنگی، کیلا اور پرتقال، مشروبات میں کاکاکولا، اور فنٹا، ایران کی دعوتوں میں شراب کی بھی فراوانی رہتی تھی، یہاں اس کا نام ونشان بھی نہ تھا، کھانے میں میزبان اور ہرات کے بہت سے علماء وفضلاء بھی شریک تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس آئے اور یہاں تھوڑی دیر تک استراحت کرنے کے بعد پھر مزارات وتاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے، روانہ ہوئے، سب سے پہلے ہم ہرات کی مشہور مسجد "مسجد جامع ہرات" گئے۔ یہ مسجد وسط شہر میں

ایک پُر رونق بازار کے سامنے واقع ہے، ہمارے راستے میں ہرات کے لوگ سڑکوں کے دونوں طرف پیادہ رو پر قطار باندھے کھڑے تھے، ان میں عمامہ پوش بوڑھے جوان اور بچے بھی تھے، لیکن ان تماشہ بین میں کوئی عورت نہ تھی، ہم جہاں جہاں گئے، وہاں لوگوں نے اظہار خوشی کیا، اور پھول برسا کر ہمارا خیر مقدم کیا، یہ مسجد جامع ایک کشادہ سڑک پر واقع ہے، یہ مسجد ہرات کی نفیس و پُرشکوہ عمارتوں میں سے ہے، اسے سلطان غیاث الدین محمد بن سام غوری نے ۵۹۷ھ میں تعمیر کرایا تھا، صحن مسجد میں سنگ فرش کیا ہوا ہے، یہاں ایک بہت بڑی آہنی دیگ بھی ہے، جس میں غالباً زمانہ قدیم میں پانی بھر دیا جاتا ہوگا۔ محمد غوری کی ۵۹۹ھ میں وفات ہوگئی تھی، اس کی قبر ایک بقعہ میں ہے، جو مسجد کے شمال میں واقع ہے، اس کی چھت خراب ہوگئی ہے، جس کی مرمت ہو رہی تھی۔ سلطان حسین بایقرا اور امیر علی شیر نوائی نے اس مسجد کی مرمت اور تزئین و کاشی کاری کی طرف توجہ کی، اسے دیکھ کر مشہد کی مسجد گوہر شاد کی یاد آگئی دونوں کی طرز تعمیر میں خاصی مشابہت ہے، مسجد کے میناروں اور گنبد کی کاشی کاری بڑی خوبصورت ہے، بلند محرابوں پر قرآن کی سورتیں طغرا میں تحریر ہیں۔ مسجد کی بعض دیواروں کی کاشی کاری قابل مرمت ہوگئی ہے، چنانچہ ایک کمرے میں منقش اینٹوں کے بنانے کا کام ہو رہا تھا، کئی کاریگر کام میں مشغول تھے۔

(باقی)

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی کی بے نظیر کتاب عرصہ سے ختم ہوگئی تھی، اب اس کا نیا ایڈیشن شایع ہوگیا ہے۔ قیمت :- ۶-۲۵

قلقشندی اور صبح الاعشیٰ

از
محمد نعیم صدیقی ندوی ایم، اے (علیگ)

ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر میں تاتاریوں کے فتنۂ بلاخیز نے جہان اسلامیان عالم کو سیاسی اور معاشی حیثیت سے زوال و انحطاط کی ذلتوں سے دوچار کیا وہیں اس سے دنیائے علم و فن کو بھی ناقابل تلافی نقصانات پہونچے۔ تاتاریوں نے بغداد اور دوسرے دیار و امصار پر یورش کے دوران صرف خلیفہ اور حکام و امرار ہی کے قتل پر اکتفا نہیں کی بلکہ بے شمار علما کو بھی تہ تیغ کیا۔ اور علوم و فنون کا وہ تمام بیش بہا ذخیرہ جو صدیوں کی عرقریزیوں کا ثمرہ تھا، چشم زدن میں غرق آب یا نذر آتش کر دیا گیا، بلاشبہ یہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت افسوسناک حادثہ اور سیاہ ترین ورق ہے۔ بلکہ شاید پوری تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ عظیم کسی المیہ کا ظہور نہیں ہوا۔

اس پرآشوب عہد میں صرف مصر و شام دو ایسے ملک تھے۔ جو بعض وجوہ سے اس موج خوں کی زد سے مامون رہے، اور واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون کو باقی رکھنے اور فروغ دینے میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے، اس وقت ان ملکوں میں سلاطین ممالیک حکمرانی کر رہے تھے۔ جن کے بعض علم دوست اور علما نواز حکمرانوں کی توجہ سے اسکندریہ، اسیوط، فیوم، دمشق، حمص، حلب اور حماۃ وغیرہ میں بخارا، سمرقند، نیشاپور، رے اور بغداد

و قرطبہ کی سی علمی و ادبی مجلسیں آراستہ ہوگئیں۔

یہ صحیح ہے کہ فتنۂ تتار نے بخارا، نیشاپور، اور بغداد کے بڑے بڑے عدیم المثال اور نادر کتب خانوں کو خاکستر کرکے اپنے نزدیک صفحۂ ہستی سے علم و فن کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اسی خون صد ہزار انجم سے وہ سحر تازہ پیدا ہوئی جسے "تحریک موسوعات" کا نام دیا جاتا ہے، چنانچہ اس عہد میں اس کثرت سے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف کا کام ہوا کہ بعض محققین نے اسکو "عصر موسوعات" سے تعبیر کیا ہے،[1] یہ حقیقت ہے کہ ان مخصوص سیاسی انقلابات کے بغیر عربی زبان میں اتنے مفید و ضخیم انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا خیال شاید پیدا نہ ہوتا۔ جب مصر و شام کے ممتاز اہل علم ذخائر کتب کی اس وسیع پیمانے پر تباہی کو دیکھا تو وہ اسلاف کی صدیوں کی کمائیوں کے باقی ماندہ گنج ہائے گرانمایہ کو یکجا کرکے ایک سلک گہر میں پرونے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ بلاشبہ یہ کام بہت دیدہ ریزی اور جانکاہی کا طالب تھا، لیکن جس طرح ان ماہرین فن نے کوہ کنی کرکے جوئے شیر نکالی ہے، اس نے ان کو علم و فن کی تاریخ میں حیات ابدی عطا کی ہے، ان نامور فضلاء میں شہاب الدین النویری (نہایۃ الارب) ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار) ابن منظور الانصاری (لسان العرب) اور قلقشندی (صبح الاعشیٰ) کے نام نمایاں ہیں[2]

مذکورہ بالا تمام موسوعات پر اپنے مرتبین کے مخصوص ذوق و رجحان کا رنگ غالب ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ سب علوم و فنون کا حسین گلدستہ بلکہ گنجینۂ معارف اور خزینۂ حکمت ہیں، پیش نظر مضمون میں راقم سطور کا مقصود صبح الاعشیٰ قلقشندی پر تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہو لیکن اس سے پہلے پس منظر کے طور پر چند سطور میں دوسرے موسوعات کا اجمالی جائزہ لینا بھی ضروری ہے، تاکہ اس سے صبح الاعشیٰ کی اہمیت اور اس کا مقام نمایاں ہوکر سامنے آسکے۔

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۱۲　[2] ایضاً ج ۳ ص ۲۲۵

نہایۃ الارب

یہ عہد ممالیک کی سب سے اہم انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کے مؤلف احمد بن عبدالوہاب محمد بن عبد الدائم البکری ہیں، جنھوں نے شہاب الدین النویری کے نام سے شہرت پائی، یہ ۶۷۷ھ ۱۲۷۹ء میں مصر کے ایک گاؤں نویرہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طفولت وہاں گذار کر قوص آگئے، جو اس عہد میں پورے مصر میں اپنی علمی و ادبی فضا کے لیے مشہور تھا۔ اسی شہرستان علم میں نویری نے نشو و نما پائی۔ اور منتخب زمانہ ارباب فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کی، تحصیل علم کے بعد سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون کے دامان حکومت سے وابستہ ہوگئے۔ اس نے ان کو طرابلس کی فوج کے عہدۂ نظارت پر مامور کیا ایک مدت تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد پھر کوچۂ علم کی یاد آئی طبعاً ان کا ذوق بھی یہی تھا لیکن رجحان طبع کے علی الرغم معاشی مجبوریوں کے باعث حکومت کی ملازمت اختیار کرنی پڑی تھی۔ جس سے بالآخر گلو خلاصی حاصل کرکے پھر مطالعہ و تحقیق میں منہمک ہوگئے۔ اور نہایۃ الارب۔ جیسی شہرۂ آفاق اور ضخیم کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئی جس نے نویری کو ایک عظیم مؤرخ، وسیع المطالعہ محقق اور صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے بقائے دوام عطا کی۔

نہایۃ الارب کے سبب تالیف کے بارے میں نویری نے کتاب کے مقدمہ میں خود تصریح کی ہے کہ حکومتی ذمہ داریوں سے علیحدگی کے بعد جب انھوں نے مطالعہ کی بزم آراستہ کی تو اثنائے مطالعہ جو چیزیں اہم، مفید اور معلومات افزا نظر آئیں ان کو نوٹ کرتے گئے پھر اس کا ذخیرہ اتنا زیادہ ہوگیا کہ انھوں نے اس کو ایک سلک گہر میں منسلک کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اسی کے نتیجہ میں یہ ضخیم کتاب تالیف ہوئی۔ یہ کتاب تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ نویری نے اس کو پانچ فنون میں تقسیم کیا ہے اور پھر ہر فن پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا فن آسمان

وزمین، آثار علویہ اور معالم سفلیہ سے متعلق ہے۔ دوسرے میں انسان اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ تیسرا فن حیوان صامت کے بارے میں ہے، چوتھے میں نباتات کا ذکر ہے، اور پانچواں فن تاریخ سے متعلق ہے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد تک جتنے انسانی علوم وفنون مروج تھے۔ سب کو نویری نے قدماء کی کتابوں سے اخذ کر کے نہایت خوبصورتی کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔ نہایۃ الارب کی ہر جلد مؤلف کی عرق ریزی، کاوش ومحنت، وسعت مطالعہ معیاری ادبی ذوق اور حسن سلیقہ پر شاہد عدل ہے جب اس کا مطالعہ کرنے والا نویری کی حیرت انگیز وسعت معلومات کو دیکھتا ہے تو وہ مجسم حیرت واستعجاب بن کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ آسمان کا ذکر کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں صرف اہل نجوم اور ماہرین فلکیات کے بیانات اور ان کے نتائج تحقیق کے ذکر ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قرآن وحدیث میں جو کچھ آسمان کے متعلق مذکور ہے، اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ پھر ایسے امثال ومحاورات نقل کرتے ہیں جن میں لفظ "السماء" آیا ہے، اس کے بعد کثرت سے ایسے اشعار یکجا کرتے ہیں جن میں آسمان کا وصف یا اس کی تشبیہات آئی ہیں۔ اتنا کرنے کے بعد پھر ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جن میں "فلک" کا لفظ آیا ہے۔ ان سب سے فارغ ہو کر تاروں اور آفتاب وماہتاب کی معلومات آفریں تفصیلات بیان کرنے لگتے ہیں، اور پھر اسی سلسلہ کلام میں اجرام سماوی، ملائکہ، بادل، بارش اور ژالہ باری کے اسباب، برق وصاعقہ، گردش لیل ونہار، اور مختلف موسموں کے بارے میں ایسی ایسی معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں کہ چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔[1]

---

[1] مصادر کے لیے ملاحظہ فرمائیں، الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۴۵، الطالع السعید ادفوی ص ۴۷، الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۱ ص ۱۹۷، حسن المحاضرۃ سیوطی ج ۱ ص ۲۳۹، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۲۲۵، معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۸۱۴

اسی نہج پر انھوں نے شعر وادب، امثال وحکم، غنا وموسیقی زہد ورندی، نظام حکومت ووزارت، جنگ وتجارت اور محکمہ قضا وغیرہ کے بارے میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے، غرض نہایۃ الارب ایسا دائرۃ المعارف ہے، جس کے نگارخانے میں ہر طرف علم وادب کی قندیلیں فروزاں دیکھکر قاری کی نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔

مسالک الابصار اس جغرافیائی موسوعہ کے مؤلف ابو العباس شہاب الدین احمد بن یحییٰ بن فضل اللہ ۳ شوال ۷۰۰ھ کو دمشق میں پیدا ہوئے۔ حضرت عمر فاروق سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث دنیائے علم میں "العمری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ دمشق کے علاوہ قاہرہ، اسکندریہ اور حجاز وغیرہ کا سفر کر کے نادرۂ عہد اہل علم اور ماہرین فن سے اکتساب فیض کیا۔ قاہرہ میں محکمہ قضا اور کتابت کے مختلف ذمہ دار عہدوں پر مامور ہوئے، پھر وطن مالوف واپس آکر وہیں ۹ ذی الحجہ ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔

ابن فضل اللہ العمری ادب، تاریخ انشا اور دوسرے بہت سے علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن خاص طور پر ہندوستان کے عہد وسطیٰ، ترک سلاطین، جغرافیہ اور تقویم البلدان میں ان کو درجہ امتیاز واستناد حاصل تھا، اور وہ اکابر عصر کے سوانح واخبار کے سب سے بڑے واقفکار شمار ہوتے تھے، نظم ونثر دونوں پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی، مبداء فیاض سے حافظہ بھی نہایت قوی پایا تھا، جمال ظاہری کے ساتھ حسن خلق ومروت کا بھی پیکر تھے،

ابن شاکر کتبی نے فوات الوفیات میں ان کے کمالات علم وفضل پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔

عمری نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ لیکن بایں ہمہ کافی بڑا اور گرانقدر تحریری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ مسالک الابصار کے علاوہ خیر الدین زرکلی نے ان کی درج ذیل کتابوں کے نام

شمار کرائے ہیں۔ الدرر الفرائد[۱]، الشتویات[۲]، النبذ[۳] الکافیۃ فی معرفۃ الکتابۃ والقافیۃ، ممالک[۴] عباد الصلیب، التعریف[۵] بالمصطلح الشریف، فواضل[۶] السمر فی فضائل آل عمر (چار جلد) یقظۃ[۷] الساھر، نفحۃ[۸] الروض، دمعۃ[۹] الباکی، صبابۃ[۱۰] المشتاق (مدائح نبوی چار جلدوں میں)

العمری کی شہرۂ آفاق موسوعہ "مسالک الأبصار فی ممالک الامصار" بیس جلدوں پر مشتمل ہے، یوں تو اس میں دنیا جہان کی باتیں ہیں مگر پوری کتاب پر جغرافیہ و تاریخ کا رنگ غالب ہے جن میں العمری کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ خود مؤلف کی تصریح ہے کہ:

وصف الارض وما اشتملت — (اس میں) زمین اور اس کے مشتملات
علیہ برا وبحرا وھو قسمان — خشکی وتری کا بیان ہے۔ اس کے
أولھما فی الارض وثانیھما — دو حصے ہیں ایک حصہ زمین سے
فی سکان الارض — متعلق ہے اور دوسرا زمین کے
" " " " " — باشندوں سے۔

پہلے حصہ میں جغرافیہ اور تقویم البلدان کے مباحث ہیں اور خاص طور پر مصر و شام اور حجاز کے جغرافیہ اور تقویم پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں اقوام و ممالک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مغرب و مشرق کے بکثرت علما، فقہا، اطباء اور اہل سیاست کے تراجم تحریر کئے ہیں، اس کے علاوہ حیوانات، طیور و وحوش اور نباتات و جمادات وغیرہ پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے زمانے کے عام دستور کے مطابق العمری نے بھی اس موسوعہ کو علم و ادب کا حسین سنگم بنا دیا ہے اس کتاب کا بنیادی موضوع جغرافیہ ہے۔ لیکن

مؤلف نے ادب، تاریخ، تقویم اور مذہب و تمدن کے امتزاج سے اس خشک موضوع کو باغ و بہار اور دلچسپ معلومات کا سمندر بنا دیا ہے۔ خود کار مشین کی طرح بات سے بات نکلتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب آٹھویں صدی کے علمی و ادبی ارتقاء اور تاریخی و جغرافیائی معلومات خصوصاً اس عہد کی تاریخ ہند کا مستند ترین ماخذ ہے۔[۱]

لسان العرب اس شہرۂ آفاق معجم کے مؤلف ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن علی بن احمد الانصاری محرم سنہ ۶۳۰ھ میں پیدا اور شعبان سنہ ۷۱۱ھ میں بمقام قاہرہ فوت ہوئے۔ دنیائے علم میں ابن منظور کے نام سے شہرت حاصل کی۔ وقت کے کبار علماء کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کرکے ادب و انشاء، نحو و لغت، اور تاریخ و کتابت میں مہارت تامہ حاصل کی۔ بقول حافظ سیوطی ادب اور انشاء میں خاص طور پر وہ اپنے زمانے کے مشہور فاضل اور مسلم الثبوت امام خیال کئے جاتے تھے۔

ابن منظور کو ادب کی مطول کتابوں کی تلخیص کا خاص شغف اور ذوق تھا، اور بقول صاحب الدرر الکامنہ "کان لا یمل من ذلک" یعنی وہ اس کام سے اکتاتے بھی نہیں تھے، انھوں نے کتاب الاغانی، العقد الفرید، الذخیرہ، مفردات ابن بیطار اور بکثرت تاریخی و ادبی کتابوں کا خلاصہ کیا ہے، حافظ ابن حجر نے صفدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

لا اعرف فی الأدب — مجھے ادب میں جس مطول کتاب کا
وغیرہ کتابا مطولا إلا وقد — بھی علم ہے اس کو انھوں نے مختصر

[۱] مراجع کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ فوات الوفیات ج ۱ ص، حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۴۲۵
الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۱ ص ۳۳۱ الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۸۵ معجم المطبوعات ج ۱

وقد اختصره

کر دیا ہے۔

خود ابن منظور کے صاحبزادے قطب الدین سے منقول ہے کہ انه ترک بخطه خمسمائة مجلد۔ یعنی انھوں نے پانچ سو جلدیں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادگار چھوڑی ہیں۔

ایک طویل مدت تک مصر کے دیوان انشاء میں ملازم رہے۔ اور کچھ عرصہ طرابلس میں قضا کی خدمات بھی انجام دیں۔ عمر کے آخری حصے میں نابینا ہو گئے تھے، علامہ سبکی اور حافظ ذہبی کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔

لسان العرب ابن منظور کی وہ عظیم اور مشہور ترین تالیف ہے، جس سے ساتویں صدی ہجری میں تالیف موسوعات کی بنیاد پڑی۔ یہ بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ اسّی ہزار لغوی مادوں کا مجموعہ ہے، اس لحاظ سے یہ اب تک کے عربی معاجم میں سب سے عظیم لغت شمار کی جاتی ہے، اس کی ترتیب میں ابن منظور نے صحاح جوہری کا طرز و نہج اختیار کیا ہے، اگرچہ بنیادی طور پر یہ کتاب لغت سے متعلق ہے، لیکن ضمنی طور پر اس میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مباحث اور موضوعات کا ذکر آگیا ہے۔ یہ دراصل کوئی مستقل بالذات (original) تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ خود ابن منظور نے اس کے مقدمہ میں تصریح کر دی ہے کہ "تہذیب اللغۃ لابی منصور الازہری، الصحاح للجوہری، اس پر بری کے حواشی، المحکم لابن سیدہ، الجمہرہ لابن درید اور النہایہ لابن اثیر کے جو مفید مضامین منتشر اور پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو اس کتاب میں سلیقہ سے یکجا کر دیا گیا ہے" اور اس نقل و اقتباس میں ابن منظور نے اتنی دیانت و امانت کا ثبوت دیا ہے کہ اصل عبارت میں اپنی طرف سے کہیں بھی حذف و اضافہ یا ترمیم نہیں کی ہے۔

اسی لیے وہ مقدمہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ: "اس کتاب میں میرا کام صرف اتنا رہا ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں میں جو کچھ منتشر تھا، میں نے اس کو بعینہٖ ایک لڑی میں پرو کر پیش کر دیا ہے، اور بس۔ چنانچہ اس میں اگر کوئی خوبی یا تسامح، لغزش یا کوتاہی اور مدح و قدح کے لائق کوئی بات نظر آئے تو اس کے ذمہ دار اور مستحق اصل مؤلفین ہیں، میں نہیں، اسی طرح اگر اس کتاب سے کوئی کچھ نقل و اخذ کرے گا، تو وہ گویا اصل ماخذ سے استفادہ کر رہا ہے۔"[1]

قلقشندی

مذکورہ بالا مرتبین انسائیکلوپیڈیا کی فہرست میں آخری شخصیت قلقشندی کی ہے جن کی شہرۂ آفاق ضخیم تصنیف صبح الاعشیٰ سے آج عربی زبان و ادب کا ہر حلقہ پُرشور ہے، بلکہ قلقشندی اور صبح الاعشیٰ دونوں کچھ اس طرح لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ایک کے ذکر کے ساتھ دوسرے کا تصور خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔ لیکن نہایت تعجب کا مقام ہے کہ باین شہرت و عظمت ارباب سیر و تذکرہ نے قلقشندی کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا ہے جس کا وہ درحقیقت مستحق ہے، اسی باعث اس کے حالات و سوانح کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ میرے علم کے مطابق غالباً سب سے زیادہ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں اس کا تذکرہ لکھا ہے۔ مگر وہ بھی نصف صفحہ سے زائد نہیں اور اس میں بھی تحقیق کی بعض غلطیاں موجود ہیں۔ اسی پر دوسرے مآخذ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے بلاشبہ قلقشندی

---

[1] مراجع کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ فوات الوفیات کتبی ج ۲/ ۳۳۱، نکت الہمیان ص ۲۷۵، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۱۰۶، مفتاح السعادۃ طاش کبری زادہ ج ۱ ص ۱۰۶، الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۴ ص ۲۶۲، معجم المطبوعات ج ۱ ص ۲۵۶، مقدمہ لسان العرب۔

اپنی تمام شہرت وعظمت اور قبول عام کے باوجود عربی زبان کے مظلوم ادیبوں کی صف میں شامل ہے بہرحال راقم سطور کو تلاش و تفحص کے بعد قلقشندی کے حالات و کمالات کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہو سکیں وہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں[1]۔ اس کے بعد انشاء اللہ العزیز صبح الاعشی کے مباحث کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

نام اور مولد و منشا شہاب الدین لقب، ابو العباس کنیت اور احمد بن علی نام تھا قلقشندی وطنی نسبت ہے۔ وہ نسلاً خالص عرب تھا اس کا خاندان قبیلہ بنو فزارہ سے تعلق رکھتا تھا، جو اسلامی فتوحات کے زمانے میں عرب سے مصر آکر آباد ہو گیا تھا، قلقشندی باتفاق روایت ۷۵۶ھ میں مصر کے مدیریہ القلیوبیہ کے ایک گاؤں قلقشندہ میں پیدا ہوا[2]۔ وطنی نسبت کی شہرت نے اصل نام پر خمول کے دبیز پردے ڈال دیئے یاقوت رومی نے معجم البلدان میں اس بستی کا نام قلقشندہ کے بجائے قرقشندہ (بالراء) تحریر کیا ہے[3]۔ لیکن کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہو سکی اس زمانہ میں یہ گاؤں قاہرہ سے جنوب میں صرف تین فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا، اور اپنی سرسبزی و شادابی کے اعتبار سے پورے ملک میں امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ اسی کی مردم خیز خاک سے دوسرے صدی ہجری میں امام لیث ابن سعد جیسی عہد آفریں شخصیت پیدا ہوئی۔ جو زمرہ تبع تابعین کا گل سرسبد شمار ہوتی ہے۔ علم و فضل، تفقہ فی الدین

---

[1] مراجع کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔ الضوء اللامع سخاوی ج ۲ ص ۸، کشف الظنون ۲/۱۳۳، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۳ ص ۱۳۳، شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۴۹، مقدمہ صبح الاعشی ج ۱ ص ۴، البدر الطالع ج ۱، القلقشندی تالیف ڈاکٹر عبد اللطیف حمزہ [2] حافظ سخاوی اور ابن عماد حنبلی نے قلقشندی کا سلسلہ نسب یہ لکھا ہے، احمد بن علی بن احمد لیکن جرجی زیدان نے تاریخ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۹)

فیاضی و سیر چشمی اور تواضع و مدارات ان کے سوانح حیات کی جلی سرخیاں ہیں، حدیث کی کوئی متداول کتاب ایسی نہیں ملے گی، جس میں لیث بن سعد کی مرویات موجود نہ ہوں۔ ان سے سماع و روایت کو کبار ائمہ اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے تھے۔ فقہی حیثیت سے وہ مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے، لیکن دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح ان کے استنباطات اور مجتہدات مدون و مرتب نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے ان کے فقہ و اجتہاد کو عمومی شہرت حاصل نہ ہو سکی جلالت علمی کے ساتھ دنیاوی جاہ و جلال اور مال و دولت سے بھی بہرہ وافر نصیب ہوا تھا[1]

تعلیم و تربیت اسی خطۂ ارض سے آٹھویں صدی ہجری میں شہاب الدین القلقشندی جیسا گوہر شب چراغ پیدا ہوا۔ قلقشندی کی نشو و نما تمام تر علمی ماحول میں ہوئی۔ طلب علم کے سلسلہ میں وہ ایک مدت تک اسکندریہ میں مقیم رہے۔ جہاں انھوں نے اپنے زمانے کے مشاہیر اہل علم سے مروجہ علوم کی تحصیل کے ساتھ عربی زبان و ادب میں خصوصی کمال پیدا کیا۔ اسکندریہ کے دوران قیام میں ان کو آٹھویں صدی کے مشہور فاضل اور جامع الکمالات شخصیت قاضی ابو حفص سراج الدین عمر بن علی سے جو علمی دنیا میں ابن الملقن کے نام سے معروف ہیں، تلمذ خاص کا شرف حاصل ہوا، شیخ ابن الملقن حدیث، فقہ، رجال اور عربی زبان و لغت پر یکساں عبور رکھتے تھے، محققین نے ان کی علمی بلندی مرتبت کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حافظ ابن حجر کو ان سے اختلاف تھا لیکن شدید

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸) آداب اللغۃ العربیہ میں لکھا ہے کہ "ہم نے قلقشندی کی کتاب قلائد الجمان میں اس کا نام و نسب اس طرح لکھا دیکھا ہے۔ شہاب الدین ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن احمد بن عبد اللہ[4] بن سلیمان اسماعیل الشہیر بابن ابی غدہ (جلد ۳ ص ۱۳۳) [3] معجم البلدان جلد ۷ ص ۵۰، [1] تاریخ بغداد خطیب جلد ۳ ص ۱۱، صفوۃ الصفوۃ جلد ۴ ص ۲۰۵، الرحمۃ الغیثیہ، تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۷۴، تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۲۰۴، تہذیب التہذیب ابن حجر ج ۸ ص ۴۶۳

نقد وجرح کے باوجود وہ بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے کہ کان ابن الملقن اعجوبۃ عصرہ فی کثرۃ التصانیف۔ یعنی وہ اپنی کثرت تصانیف میں اعجوبہ روزگار تھے۔[1]

۷۷۸ھ میں ان ہی شیخ ابن الملقن نے قلقشندی کو درس وافتا کی اجازت مرحمت فرمائی۔ چونکہ شیخ مذکور بہت متقشف شافعی المسلک تھے، اس لیے اپنے تلمیذ رشید کو بھی اسی مسلک کے مطابق فتویٰ دینے کی تلقین کی نیز صحاح ستہ، اور مسند شافعی اور مسند ابن حنبل کی روایت کی بھی اجازت دی، حالانکہ اس وقت ابن الملقن کا رہوار عمر اکیسویں منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا، اس سے ان کی صلاحیت اور علمی کمال کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

درس وافادہ | جب قلقشندی نے مسند درس پر قدم رکھا تو ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کے لیے بے شمار شائقین علم جمع ہوگئے۔ اور ان کی بساط درس کے حاشیہ نشین نادرۂ عہد فضلاء بن کر نکلے۔ قلقشندی نے اپنے سیکڑوں تلامذہ کو خرقہ وسند اجازہ سے سرفراز کیا۔ اس زمانہ میں فقہ کے ساتھ ان کو خصوصی اعتنا پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ علم فقہ میں درج ذیل دو کتابیں تالیف کیں۔ الغیوث الھوامع (یہ شافعی مسلک کی فقہی کتاب جامع المختصرات کی شرح ہے) اور کتاب الحاوی الصغیر کی شرح۔ فقہ کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی دلچسپی بڑھتی گئی، اور اسی زمانہ تدریس میں کئی ادبی رسائل تحریر کیے۔ علاوہ ازیں کنہ المراد کے نام سے کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے قصیدۂ بانت سعاد کی شرح بھی لکھی۔ جس کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں کہ "اللہ جل شانہ نے اس شرح میں مجھ پر کچھ ایسے معانی ومطالب منکشف فرمائے۔ جو اس سے پہلے میں نے اس قصیدہ کی کسی شرح میں نہیں دیکھے"

[1] تفصیل کیلئے دیکھیں الضوء اللامع ۱۰۰/۷، شذرات الذہب ج ۷، ص ۴۴، ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۹۷، البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۸، الاعلام زرکلی ج ۲ ص ۲۰، حسن المحاضرۃ سیوطی ج ۱ ص ۱۸۶

خلیفہ چلپی نے کنہ المراد کو ابن حجر کی طرف منسوب کیا ہے۔[1] استاذ ابراہیم الابیاری نے قلقشندی کی تالیف نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس شرح (کنہ المراد) کا ایک ایک نسخہ دار الکتب المصریہ اور کتب خانہ ازہر میں ہے۔ اور یہ دونوں حافظ سیوطی کی طرف منسوب ہیں۔ قصیدہ بانت سعاد کی شروح بہت کثرت سے لکھی گئی ہیں، اس لیے کوئی استبعاد نہیں کہ قلقشندی نے بھی کنہ المراد ہی کے نام سے اس کی شرح لکھی ہو۔

دیوان انشا سے وابستگی | اب قلقشندی کی علمی شہرت اور فقہ وادب میں غیر معمولی مہارت کے غلغلہ سے پورا ملک گونج اٹھا تھا۔ چنانچہ حکام وسلاطین وقت کی نگاہیں بھی ان کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ ۷۹۱ھ میں جب مصر میں دولت ممالیک کا آفتاب اقبال بلند تھا، دیوان انشاء میں کارگذاری کے لیے قلقشندی کا انتخاب عمل میں آیا۔ محققین نے لکھا ہے کہ اس منصب پر مامور ہونے کے بعد قلقشندی کی ذہانت اور جودت طبع کے جوہر نمایاں ہوکر سامنے آئے۔ اسی زمانے میں اس نے قاضی محی الدین ابن فضل اللہ کی جو اس وقت دیوان انشا کے صدر تھے، تقریظ میں "الکواکب الدریۃ فی المناقب البدریۃ" کے نام سے ایک مقامہ لکھا۔ جس میں فن انشاء کی تعریف اس کی اہمیت وافادیت اسکی نزاکتوں اور فن کتابت کے اصول وضوابط پر بحث کی ہے، مگر حد سے زیادہ ایجاز کے باعث اس میں کافی ابہام وتعقید پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ قلقشندی نے اس کے اختصار، اشارات اور ابہام کو دوبارہ وضاحت وتفصیل کے ساتھ لکھا، جس کے نتیجہ میں چودہ ضخیم جلدوں پر مشتمل صبح الاعشیٰ منصہ شہود پر آئی۔

اسلوب نگارش | قلقشندی کا اسلوب نگارش اور طرز تحریر اپنے عہد کے عمومی رنگ سے

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۳

ہم آہنگ ہے، جس کی بنیاد تخئیل آرائی اور محسنات بدیعیہ یعنی سجع و قوافی، اجناس و طباق اور مبالغہ آفرینی پر ہے۔ اس زمانہ کے تمام ممتاز ادبار مثلاً قاضی فاضل ابن بناتہ ابن فضل اللہ العمری وغیرہ کے طرز تحریر کا یہی طغرائے امتیاز تھا۔ لیکن باین ہمہ قلقشندی کے ہاں تعقید و اغلاق اور ابہام و اشاریت کے بجائے وضاحت و شگفتگی نسبتہً زیادہ ملتی ہے۔ دیوان انشار سے وابستگی کے بعد اس نے جو مذکورۃ الصدر مقامہ لکھا تھا، اس سے اس کے تبحر علمی، ادبی کمال اور قوت حافظہ کا پورا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ صبح الاعشی میں بھی مسجع نثر کی قوس قزح موجود ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیش از بیش معلومات فراہم کرنے کی فکر میں اس صنعت کا التزام پوری کتاب میں باقی نہیں رکھ سکے۔

تصنیفات | قلقشندی کی سب سے مشہور تصنیف جس نے اس کو بقائے دوام کے دربار میں صف پیش میں جگہ دی ہے۔ صبح الاعشی ہے اس پر چونکہ آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے یہاں اس سے تعرض کیے بغیر قلقشندی کی دوسری تصنیفات کا ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب۔ قلقشندی کا خیال تھا کہ فن انشار میں مہارت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک علم انساب العرب سے پوری واقفیت نہ ہو۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اس نے علم الانساب کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں ایک تو یہی زیر نظر نہایۃ الارب دوسری قلائد الجمان جس کا ذکر آگے آرہا ہے، نہایۃ میں حروف معجم کے مطابق مختلف قبائل اور ان کی شاخوں کے نام مرتب کئے گئے ہیں، یہ کتاب استاذ ابراہیم الابیاری کی تصحیح و تہذیب کے ساتھ مصر سے شائع ہوگئی ہے جس پر فاضل مصحح کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر، برلن اور برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں۔

۲۔ قلائد الجمان فی قبائل العربان۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ کتاب بھی انساب عرب سے متعلق ہے۔ اس کی تالیف سے رجب ۸۱۹ھ میں یعنی وفات سے صرف دو سال قبل فراغت پائی۔ خلیفہ چلپی نے کشف الظنون میں اس کتاب کو قلقشندی کے والد کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ نہایۃ الارب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن بقول شیخ محمد عبد الرسول رحمٰن کی تصحیح و تنقیح کے ساتھ صبح الاعشی مصر سے شائع ہوئی ہے، "بہت تلاش و جستجو کے باوجود بھی نہایۃ الارب میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملا"

۳۔ ضوء الصبح المسفر۔ یہ صبح الاعشی کی تلخیص ہے۔ جو خود قلقشندی نے کی ہے۔ محمود سلامہ کی تصحیح کے ساتھ اس کا پہلا حصہ جو ۴۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبعۃ الواعظ قاہرہ سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔

(باقی)

خزانۂ عامرہ

از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی، بمبئی،

آزاد بلگرامی ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں ید بیضا اور ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں سرو آزاد ترتیب دے چکے تھے، جو فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔ یہ تذکرے کسی مخصوص نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ عام قسم کے تذکرے تھے۔ ان کے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا نے ان سے خواہش کی کہ اب وہ ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیں جس میں صرف ان شعرا کے حالات ہوں جنھوں نے ارباب کرم کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے صلہ پایا ہو۔ چونکہ آزاد بھتیجے کو عزیز رکھتے تھے، اس لئے اس کی بات مان لی۔ اس طرح خزانۂ عامرہ وجود میں آیا[1]

مصنف کے "خاتمۂ تقریب جو" اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی لکھے ہیں جن کا نام ارباب صلہ کی فہرست میں نہیں ملتا، مثلاً نظام الملک، ناصر جنگ، فیروز جنگ، عمادالملک وغیرہ۔ لیکن بقول مصنف ان کو پڑھنے کے بعد ان کی وفادیت خود بخود ظاہر ہو جائے گی[2]، چونکہ یہ تذکرہ بنیادی طور پر ارباب صلہ کے حالات میں ہے، اس لئے مصنف نے اس کا نام خزانۂ عامرہ رکھا[3]۔ یہ تذکرہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں مکمل ہوا۔ خود آزاد نے قطعۂ تاریخ کہا تھا۔

آزاد رقم نمود تو تذکرہ — درجیب ورق ریخت نقود سرہ

گنجور خرد گوہر تاریخ فشاند — حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ

[1] خزانۂ عامرہ، کانپور، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۷۱ء ص ۳ [2] ایضاً [3] ایضاً

آزاد کہتے ہیں کہ اگر میں نے اس کتاب میں صلہ و انعام کا ذکر کیا ہے تو اس سے کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ حسن طلب ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر تذکرہ نویس اپنے لیے ایک مخصوص پہلو ڈھونڈتا ہے۔ مثلاً، کسی نے ایک خاص عصر کے شعرا کا تذکرہ لکھا۔ کسی نے ایک خاص ملک کے شعرا کے حالات ترتیب دئے۔ کسی نے اپنے تذکرے کو مرد شعرا تک محدود رکھا اور کسی نے شاعرات کے حالات لکھے[1]۔ ارباب صلہ کا تذکرہ آج تک کسی نے نہیں لکھا اس لئے میں نے اس تخصیص کو اپنے لیے پسند کیا[2]۔ پھر انھوں نے اپنی بے نیازی اور استغنا کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"این دریوزہ گر فیض الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نگشودہ و نامۂ خود بستایش دولتمندی سیاہ ننمودہ۔۔۔۔۔ ہر چند با امرا ارتباط دارم وبا روسا اختلاط، اما سر رشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بدر غنا نریختہ ام، عندلیب را از مصاحبت گل زری و ماہی را از مجالست صدف گوہری مطمح نظر نباشد۔۔۔۔۔ بیت

حبابم مشت من از گوہر منت تہی آمد — نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[3]

تمہیدی سطور کے بعد آزاد نے شعر کی اصطلاحی تعریف بتائی ہے اور اس کی توصیف میں ایک صفحے سے کچھ اوپر لکھا ہے، اس ضمن میں شعر کی تاثیر و اہمیت بتانے کے لیے انھوں نے محمود غزنوی کے ایک حملے کا ذکر کیا ہے۔ محمود نے قلعۂ کالنجر کا محاصرہ کیا، وہاں کے حاکم نندا نے ہندی میں ایک شعر لکھ کر محمود کے پاس بھیجا۔ شعر میں محمود کی مدح تھی صاحب طبعان نے جو محمود کی رکاب میں تھے مضمون شعر کی تحسین کی۔ محمود اس قدر خوش ہوا کہ

[1] خزانۂ عامرہ، کانپور، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۷۱ء ص ۳ [2] ایضاً

اس نے محاصرہ اٹھا لیا، اور دوسرے پندرہ قلعے اسے عنایت کئے، اور ایران و توران کے تحائف اس کے پاس بھیجے اور غزنی کی طرف کوچ کر دیا۔

تذکرے کی ترتیب تذکرے کی ترتیب عام تذکروں کی طرح حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔ پہلا شاعر جس کے حالات لکھے گئے ہیں، انوری ہے اور خاتمہ میر یوسف بلگرامی کے حالات پر ہوا ہے شعرا کی کل تعداد ۱۳۵ ہے۔

تذکرے کے ماخذ۔ آزاد نے خزانہ عامرہ کے ماخذ بھی بتا دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

لب اللباب	محمد عوفی
تذکرۂ دولت شاہی	
تذکرۂ سامی	سام میرزا صفوی
خاتمۂ خلاصۃ الاشعار	
تذکرۂ میر تقی کاشی	
ہفت اقلیم	محمد امین رازی
منتخب التواریخ	ملا عبد القادر بدایونی
مجمع الفضلا	ملا بقائی
تذکرۂ مرزا طاہر نصر آبادی	
مرآۃ الخیال	شیر علی خان
کلمات الشعرا	سرخوش
ہمیشہ بہار	کشن چند اخلاص دہلوی
حیات الشعرا	محمد علی خان متین کشمیری

سفینۂ بیخبر	میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی
ید بیضا	آزاد بلگرامی
ریاض الشعرا	علی قلی خاں والہ داغستانی
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو
تذکرۂ شیخ محمد علی حزیں اصفہانی	
سرو آزاد	آزاد بلگرامی
تذکرۂ بینظیر	میر عبد الوہاب دولت آبادی
مردم دیدہ	حاکم لاہوری۔[1]

یہ ماخذ بتانے کے بعد آزاد کہتے ہیں کہ سوائے این تذکرہ با مواد بسیاری از دواوین شعرا و کتب فن تاریخ وغیر آن نصب العین است کہ سیر کتاب بعرض ناظران می رسانند[2]

اس سلسلے میں ان کا یہ بھی بیان ہے کہ تذکرے میں جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، وہ مذکورہ بالا تذکروں سے نہیں لئے گئے ہیں سوائے ان چند اشعار کے جو متعلقہ کتابوں میں نہ مل سکے

انتخاب اشعار کا اصول نقل اشعار کے ضمن میں آزاد لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی میں نے کسی شاعر کے اچھے اشعار کو اپنے تذکرے میں اس لیے داخل نہیں کیا کہ وہ دوسرے تذکروں میں نقل ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے بھی کچھ اشعار رہ گئے کہ مجھے شاعر کا مکمل دیوان نہ مل سکا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بھی بیان ہے کہ سرو آزاد میں اشعار نقل کرنے میں میں نے یہ التزام رکھا تھا کہ پہلے مطلعوں کو غیر مطلعوں پر مقدم رکھا تھا، خزانۂ عامرہ میں یہ التزام ملحوظ نہیں رہا لیکن اگر کسی شاعر کا دیوان مل گیا اور اس سے اشعار کا انتخاب کیا تو اشعار ردیف وار نقل کئے

---

[1] خزانہ عامرہ، ص ۶ ، ۷ [2] ایضاً، ص ،

تاکہ اگر کوئی کسی شعر کو دیوان میں دیکھنا چاہے تو وہ اُسے آسانی سے مل جائے۔ چند عربی اشعار کا انتخاب بھی تذکرے میں ملے گا اس طرح بقول خود آزاد نغمۂ عجم کے ساتھ ساتھ نوائے حجاز بھی اس میں موجود ہے۔[۵۱]

ادبی و شعری نکات یہ تذکرہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان شعرا کے حالات میں ہے جنھیں ارباب کرم سے صلہ ملا لیکن اس میں صلوں کا ذکر کم ہے۔ شعرا کے حالات میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ادبی و علمی اور شاعرانہ لطافت و نکات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اگرچہ تذکرے کا مقصد کاملاً پورا نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت بہرحال بڑھ جاتی ہے۔

خزانۂ عامرہ میں سب سے پہلا شاعر انوری ہے جس کے حالات لکھے گئے ہیں، اور وہ قصیدہ گو ہے، اس لیے آزاد نے قصیدے کے مختلف حصوں کا ذکر کیا ہے اور اس کی اہمیت بتائی ہے، جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ مطلع — اگر نہایت عمدہ ہے تو طبیعت میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے، اور سامعہ کلام مستقبل سننے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اگر حالت اس کے برعکس ہے تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اور باقی کلام سننے کو جی نہیں چاہتا چاہے وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔

۲۔ مخلص (گریز)، تشبیب و مدح کے درمیان برزخ ہے۔ قصیدے کا سب سے مشکل حصہ گریز ہے۔ کیونکہ یہ دو ایسی باتوں کو جو ایک دوسرے سے متعلق نہیں ہوتیں، ملاتا ہے۔ گریز قصیدے کی روح ہے۔

[۵۱] خزانۂ عامرہ، ص ۵

۳۔ حسن الطلب — شاعر اپنا مقصد اس سحر بیانی اور افسوں کاری سے ظاہر کرتا ہے کہ طبع ممدوح پر گراں نہیں گذرتا بلکہ بخیل کو کریم بنا دیتا ہے۔

۴۔ مقطع یا حسن الخاتمہ۔ قصیدے کو اس طرح ختم کرنا کہ سامعہ محظوظ ہو۔[۵۲]

اشعار جو نقل کئے ہیں ان کے ضمن میں بھی آزاد نے بعض اوقات معانی و نکات بیان کئے ہیں۔

مثلاً انوری کے ایک قصیدے کا مطلع نقل کیا ہے۔

جرم خورشید چو از حوت در آمد بحمل — اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

اور پھر بتایا ہے کہ اشہب سفید گھوڑے کو کہتے ہیں، ادہم مشکیں (سیاہ) رنگ کا ہوتا ہے، اور ارجل وہ گھوڑا ہے جس کے پانوں سفید ہوتے ہیں۔ اس طرح شعر کی بلاغت واضح ہو گئی اور مطلع کا حسن لفظی و معنوی طور پر نمایاں ہو گیا۔[۵۳]

ناصر علی سرہندی کا مندرجہ ذیل شعر ایک محفل میں پڑھا گیا۔

صریر خامہ می دانم کہ با طبیعت نمی سازد — دریدی نامہ، دل صد پارہ شد قاصد رسید اینجا

محمد سعید اعجاز اکبرآبادی نے اعتراض کیا کہ عاشق دور دراز سے خط لکھتا ہے اور صریر خامہ معشوق کی طبع نازک پر گراں گذرتی ہے تو پھر دریدن نامہ، کو جو صریر خامہ سے زیادہ تکلیف دہ ہے، اس نے کیسے گوارا کر لیا؟ شاہ آفرین نے جواب دیا کہ یہاں صریر خامہ خود معشوق کے قلم کی آواز ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں۔ عاشق کا خط لکھنا معشوق کی طبع کے خلاف ہے اور نامے کو پھاڑ ڈالنا اس کی طبع کے موافق ہے، اس لیے صریر خامۂ عاشق اس کی خاطر نازک

[۵۲] خزانۂ عامرہ، ص ۹-۸ [۵۳] ایضاً، ص ۲۹

پر بہت گراں گذرا اور نامہ پھاڑنے سے جو کرخت آواز پیدا ہوتی ہے، اسے اس نے گوارا کر لیا۔[۱]

کسی شخص نے شیخ محمد علی حزیں کے سامنے ایک شعر پڑھا جس میں قالین باندھا گیا تھا۔ شیخ نے کہا کہ قالی بغیر نون کے صحیح ہے، اس شخص نے آزاد سے رجوع کیا، انھوں نے کہا کہ شیخ فریدالدین عطار نے قالین (نون کے ساتھ) استعمال کیا ہے اور سند میں یہ شعر پیش کیا،

مردہ را بوریا قالیں بود زانکہ جنسش عاقبت پالیں بود[۲]

ادبی نکات کے ساتھ ساتھ یہ تذکرہ شاعرانہ کمال یا شعری لطافت کے ذکر سے بھی خالی نہیں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

صائب کا ایک شعر ہے۔

اہل کمال را لب اظہار خامشی ست منت پذیر ماہ تمام از ہلال نیست

ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی مجلس میں یہ شعر پڑھا گیا اور اس کے مختلف معنی و مفہوم بیان کئے گئے۔ لیکن آزاد نے جو مفہوم بتایا اسے سب نے پسند کیا اور اس پر تحسین کی۔ آزاد نے کہا کہ ماہ سے مراد مہینہ ہے اور ماہ تمام تیس دن کا ہوتا ہے تیسویں تاریخ کو ہلال دیکھے بغیر کہا جاتا ہے، کہ آج چاند کامل ہو گیا برخلاف اس کے انتیسویں کو یہ نہیں کہا جاتا۔[۳]

آزاد نے کبھی کبھی غیر معروف الفاظ کے تلفظ اور معنی بھی بتائے ہیں۔ مثلاً مسعود بن سعد بن سلمان کی ایک رباعی نقل کی ہے۔

ہموارہ رخ نگاہ ما تو ست نہ گل زین رو می رخ نگار نیکو ست نہ گل

۱؎ خزانۂ عامرہ، ص ۴۳ ۲؎ ایضاً ص ۱۸، ۳؎ ایضاً ص ۲۸۹۔

زیرا گل چشم ما رخ اوست نہ گل مارا رخ دوست باید ای دوست نہ گل

نو کا تلفظ عام طور پر نو ہے۔ اس خیال سے کہ قاری کو الجھن نہ ہو وہ فوراً لکھ دیتے ہیں کہ اس تلفظ کا نُو بھی ہے، اور سند کے طور پر برہان قاطع کا حوالہ دیتے ہیں۔[۴]

شاعر کوربی کا ایک شعر ہے۔

دلیک راہ زبتیارہ الین ازلی آن کہ مدح صاحب خداندم لسان مرزاز

آزاد نے لفظ بتیارہ کی صراحت کی ہے کہ یہ تیارہ بھی ہے جس کے معنی بلا اور آفت کے ہیں اور تیارہ بھی ہے جس کے معنی غول بیابانی ہے۔[۵]

بعض اعتراضات کہیں کہیں آزاد نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مثلاً، صائب کا ایک مشہور مطلع ہے۔؟

غیر حق را می دہی رہ در حریم دل چرا؟ می کشی بر صفحۂ ہستی خط باطل چرا؟

آزاد کا کہنا ہے کہ دونوں مصرع اچھے ہیں لیکن مصرع اول کا استعارہ مصرع ثانی کے استعارے سے مناسبت نہیں رکھتا۔[۶]

سنجر کاشانی کا ایک اچھا شعر ہے۔

بخسرو گو کہ شیرین دید از اصطرلاب آئینہ کہ فتح بی ستون از بازوی فرہاد می آید

آزاد کا اعتراض ہے کہ اصطرلاب حوادث کونی کے پہچاننے کے کام میں نہیں آتا۔ یہاں کسی ایسی چیز کا ذکر ہونا چاہیے جو اس کام میں آتی ہو۔ جیسے، علم تنجیم، علم رمل، علم شگون چنانچہ ان کی رائے میں مصرع یوں کہا جا سکتا تھا بخسرو گو کہ شیرین دیدہ است از شانۂ گیسو۔[۷]

قدسی مشہدی بقول خود آزاد صاحب سکہ سخن دانی تھے۔ لیکن ان کے قصائد کی

۴؎ خزانۂ عامرہ، ص ۱۴ ۵؎ ایضاً، ص ۱۸ ۶؎ ایضاً، ص ۲۹۰ ۷؎ ایضاً، ص ۲۶۱

تشبیب کے بارے میں آزاد کی رائے ہے کہ غزل کی طرح اکثر پریشان ہوتی ہے، یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ پل کا راستہ چھوڑ کر ایک ساحل سے دوسرے ساحل کو زقند بھرتے ہیں۔ یعنی مخلص (گریز) کو چھوڑ کر دفعتہً تشبیب سے مدح پر آجاتے ہیں۔ اسے اقتضاب کہتے ہیں۔ اور اس کا اثر طبیعت پر اچھا نہیں پڑتا ہے[1]

اپنے اشعار کی تشریح آزاد نے خود اپنے حالات لکھنے اور اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ فقیر کے بعض اشعار شرح طلب ہیں اس لیے میں ان کی شرح لکھے دیتا ہوں تاکہ اور کہیں رجوع کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ نیچے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

سفینۂ غزل ہست در نگاہ مرا — سواد دست بیاض است سیر ماہ مرا

دشت بیاض خراسان میں ایک سرزمین کا نام ہے۔

نخواہم آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را — کہ خوش کردم کنار زمزم در کن و مصلے را

حافظ شیرازی کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے۔ حافظ کے شعر میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ آب، رکنا باد، مصلے۔ میرے یہاں بھی تین چیزیں ہیں۔ زمزم، رکن اور مصلےٰ۔ رکن محدثین کے نزدیک حجر اسود سے عبارت ہے۔ مصلے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے۔ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ اور زمزم و مصلیٰ عین مسجد میں کعبہ کے نزدیک ہیں۔

چہ ناخنی زدہ در دل ہلال الماسی — کہ در مواجہہ مصطفےٰ ست جلوہ نما

ہلال کی شکل الماس سے تراش کر روضۂ منورہ کی دیوار میں مواجہہ کی جگہ پر لگی ہے۔

فدائے خاصیت وادئ عقیق شوم — کہ گرد ریگ روانش علاج تشنہ بہی

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۲۰۵

وادئ عقیق ایک مشہور وادی کا نام ہے، جو مدینۂ منورہ کے قریب ہے[1]

بعض اوقات انھوں نے دوسرے شعرا کے اشعار کی تلمیح کی بھی صراحت کردی ہے، مثلاً ظہیر فاریابی نے ایک قطعہ قزل ارسلان کی خدمت میں پیش کیا تھا جس میں شتر خاصہ کی درخواست کی تھی۔ اس کے آخری دو شعر ہیں۔

حکایت شتر و ماہتاب و اعرابی — شنودہ ام کہ شنیدہ است شاہ بندہ نواز

مرا کہ در شب افلاس گم شدہ است شتر — بماہتاب قبولت سزد کہ یابم باز

آزاد نے لکھا ہے کہ ان اشعار میں ایک اعرابی کے قصے کی یہ تلمیح ہے۔ اعرابی کا اونٹ اندھیری رات میں گم ہوگیا۔ وہ اس کی تلاش میں حیران و پریشان تھا کہ ناگاہ چاند نکل آیا اور اعرابی نے دیکھا کہ اس کے اونٹ کی مہار ایک درخت سے بندھی ہے اور اونٹ کھڑا ہے، وہ بہت خوش ہوا اور چاند کو مخاطب کرکے اس نے دو شعر کہے[2]

دلچسپ واقعات خزانۂ عامرہ میں بعض دلچسپ واقعات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مثلاً مندرجۂ ذیل واقعہ۔

حاکم لاہوری کی روایت ہے کہ عہد اورنگ زیب میں خان جہاں بہادر کوکہ بادشاہ ناظم لاہور ہوئے تو ایک دن نصرت خان خلف خان جہاں بہادر حویلی دارا شکوہ میں سیر کے لیے گئے، شاہ آفرین کو بھی انھوں نے وہاں بلوایا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اور ترشح ہو رہا تھا۔ نصرت خاں نے اس خوش گوار موسم کی تعریف کی۔ شاہ آفرین نے ارتجالاً یہ دو شعر کہے،

خوشا ابری وابری کم ستیزہ — کہ باران ریز وازدی ریزہ ریزہ

ز نم نقش قدم زائل نمی شد — زمین تر می شد اما گل نمی شد

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۱۳۳ [2] ایضاً ص ۵-۲۰۴

نصرت خاں نے شاعر کو نو اشرفیاں صلۂ مناسب خوانی" کے طور پر دیں۔[۲]

روایت کی درایت آزاد نے اپنے تذکرے کے ماخذ بتا دئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان تذکروں یا کتابوں کے بیانات کو پرکھ کر قبول کیا ہے۔ اختلافی مسائل میں انھوں نے صرف روایت سے کام نہیں لیا بلکہ درایت سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً والہ داغستانی نے مسعود سعد سلمان کی ہندی شاعری کا انکار کیا ہے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ ایک غیر ملکی ہندی زبان پر اسقدر عبور حاصل نہیں کر سکتا کہ اس میں شعر کہے اور صاحب دیوان ہو جائے۔ آزاد کہتے ہیں کہ خود والہ کی دلیل کی بنیاد پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسعود نے ہندی میں شاعری کی ہوگی کیونکہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ مسعود کے باپ سعد نے ہندوستان ہی میں شادی کی تھی۔ اس طرح ہندی مسعود کی مادری زبان ہوئی۔[۳]

اسی طرح علم وادب سے متعلق بعض اور مفید باتیں مثلاً، فارسی وعربی وہندی بحور، توارد فعون وغیرہ اس تذکرے میں ملتی ہیں۔

تاریخی اشارے آزاد کا طبعی رجحان تاریخ کی طرف زیادہ تھا، خزانۂ عامرہ میں بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے شعرا کے حالات لکھنے میں اختصار سے کام لیا ہے، لیکن نواب آصف جاہ، عماد الملک، مظفر جنگ، صفدر جنگ، شجاع الدولہ، شاہ درانی وغیرہ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اول الذکر کے سلسلۂ حالات میں انھوں نے مرہٹوں کی اصلیت (ORIGIN) ہر ارج ترقی اور ان کے طاقتور ہونے کے بعد ان کی فتوحات اور چیرہ دستیوں کا ذکر خصوصاً تفصیل سے کیا ہے۔ اکثر وبیشتر واقعات کے جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ وہ عینی شاہد تھے۔ ولیم جیمیز جو آزاد کے ہم عصر تھے، لکھتے ہیں کہ ان کی

[۲] خزانۂ عامرہ ص ۲۹ [۳] ایضاً ص ۱۵

(آزاد کی) تاریخی تحریریں انگریزوں کی نگاہ میں قیمتی سرمایہ ہیں، خصوصاً اس لیے کہ جن واقعات کا انھوں نے ذکر کیا ہے ان کے وہ عینی شاہد ہیں، اور ان مقامات کی سیر کی ہے۔ جن کا وہ ذکر کرتے ہیں۔[۱] آزاد نے نواب آصف جاہ کے ساتھ مرہٹوں سے جنگ میں حصہ بھی لیا تھا، جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی تالیف مآثر الکرام میں کیا ہے۔[۲] مرہٹوں کے نسب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"مرہٹ عبارت از دیوگیر و اطراف آن است و ساکنان این سرزمین را مرہٹہ گویند و زبان مرہٹی مخصوص این کسان است و ریاست غنیم در قوم بھونسلہ باشد و نسبت بھونسلہ براجہ ہای اودی پور می رسد و راجہ ہای اودی پور فوق جمیع راجہ ہاے سرزمین راجپوتانہ اند۔ از راجہ ہاے دیگر ہر راجہ کہ نو بر مسند راج می نشیند راجہ ہاے اودی پور قشقہ براے او می فرستد و او آن قشقہ افتخار را بر پیشانی ادب می کشد و لقب راجہ رانا است و او نسب خود بنوشیروان عادل می رساند چون سعد وقاص ایران را فتح کرد و اولاد نوشیروان آوارہ شدند یکی از اجداد رانا بہند آمدہ بمرتبۂ راجگی رسید و چون شہر بانو دختر یزدجرد نبیرۂ نوشیروان باسیری رفتہ درحبالۂ نکاح امام حسین رضی اللہ عنہ درآمد از بطن آن عفیفہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ متولد شد نسل سادات حسینی منحصر در امام زین العابدین است۔ درین صورت قبیلۂ راجہ ہاے اودی پور اخوال جمع خال یعنی ماموں سادات حسینی اند . . . . . یکی از اولاد رانا کہ از بطن دختر نجار بود بسبب ناموافقت برادران از اودی پور بر آمدہ بکسوۂ رکن افتاد و در طرف کرناٹک

[۱] اسٹوری، پرشین لٹریچر، جلد اول حصہ دوم ص ۸۵۹، بحوالہ Asiatic miscellany جلد ۱ ص ۹۰-۲۹۶

[۲] مآثر الکرام، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء، ص ۵-۳۰۴

ساکن شد و از جہت عمدگی خاندان خود با عمدہ ہائے دکن خویشی بہم رسانید
و اولاد او دو فرع شد۔ یکی انتولیہ، دوم بھونسلہ"[۱]

اس کے بعد انھوں نے شیواجی اور پیشواؤں کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تفصیل سے کرنے کے بعد مرہٹوں کے عام عادات و اطوار بیان کئے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے ایک اہم بات یہ لکھی ہے کہ مرہٹوں کے مختصات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے دفاتر و اسناد میں فاروقی سن عربی زبان اور مرہٹی خط میں لکھتے ہیں، اس سنہ کی ابتدا کا آغاز خلافت حضرت عمر فاروق ؓ سے یعنی تیرہ ہجری سے کرتے ہیں، اس کی وجہ آزاد یہ بتاتے ہیں کہ مرہٹوں کے جد اعلا عہد فاروق میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔[۲]

مظفر جنگ کے حالات کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنکی سرکار میں نصاریٰ ملازم ہوئے، اس سے پہلے وہ اپنی بندرگاہوں میں رہتے تھے اور ان سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے۔ نواب نظام الدولہ مظفر جنگ نے نصارائے فرانس کو اپنے یہاں ملازم رکھا اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔[۳]

معاصرین سے تعلقات تذکرے سے آزاد کے ان کے بعض معاصرین سے گہرے روابط کا بھی پتا چلتا ہے۔ صرف چند مثالیں نیچے دی جاتی ہیں۔

حاکم لاہوری اور واقف بٹالوی لاہور جا رہے تھے۔ راستے میں اورنگ آباد اور بالاپور کے بیچ میں ان کا سامان لوٹا گیا۔ بالاپور پہنچ کر ان لوگوں نے آزاد کو ایک خط لکھا جس میں ساری سرگذشت تحریر تھی، آزاد نے ہنڈی کے ذریعے کچھ رقم ان کے پاس ..... بھیجی۔ کوکھاپور پہنچ کر ان لوگوں نے پھر آزاد کے پاس قاصد بھیجا

۱ خزانۂ عامرہ، ص ۳۹ ۲ ایضاً ص ۴۹-۴۸ ۳ ایضاً ص ۶۰

کیونکہ راستہ لمبا تھا۔ وہ لوگ شمالی ہند جا رہے تھے۔ آزاد نے پھر کچھ رقم بھیج دی۔[۱]

شاہ آفرین لاہوری کے ساتھ اپنے اور ان کے اخلاص و مودت کا اظہار آزاد نے اس طرح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں سندھ جا رہا تھا، لاہور میں شاہ آفرین سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وہ ہیر رانجھا کا قصہ نظم کر رہے تھے، مجھے اس کی ایک داستان سنائی۔ جب سندھ سے لوٹا تو پھر ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ مجھ سے تذکرۂ ید بیضا کا نسخہ جو نقش ناتمام تھا، لیا اور اپنی مثنوی انبان معرفت خود اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی، مجھے عنایت کی۔[۲]

عبدالوہاب افتخار نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ وارستہ (لاہوری) کا بیان ہے کہ میر غلام علی آزاد کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کی بہت سی غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ اشعار عمرو و زید کے نام سے اور انکار زید و عمرو کے نام سے منسوب کر دئے ہیں، اس کے بعد افتخار کہتے ہیں کہ وارستہ کی مراد اسی نسخے سے ہے، جو شاہ آفرین نے ان سے لیا تھا۔[۳] اس ضمن میں خود آزاد کا بیان بھی قابل غور ہے۔ انھوں نے ید بیضا کے دیباچے میں لکھ دیا ہے کہ شعرا کے اکثر اشعار خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس واضح بیان کے بعد وارستہ کا اعتراض بلا ضرورت ہے۔

حاکم لاہوری نے ایسے فارسی گو شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے، اس کا نام انھوں نے تحفۃ المجالس رکھا لیکن آزاد نے اس کا نام مردم دیدہ تجویز کیا اور کہا کہ یہ نام اسم بامسمّٰی بھی ہے اور اس میں ایہام بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ

۱ خزانۂ عامرہ، ص ۱-۲۔ ۲ ایضاً، ص ۲۹-۲۸۔ ۳ تذکرۂ بینظیر مرتبہ سید منظور علی، الہ آباد، سینٹ ہاؤس، ۱۹۴۰ء، ص ۵

تذکرہ اسی نام سے موسوم ہوا۔[1] خود حاکم نے لکھا ہے کہ "این رسالہ را بموجب فرمودۂ میر صاحب آزاد مردم دیدہ نام نہادم۔"[2] ڈاکٹر سید عبد اللہ (لاہور) نے اسے مرتب کرکے شائع کرا دیا ہے۔

آزاد کی زبان آزاد کی زبان مجموعی حیثیت سے صاف، سلیس اور رواں ہے، انداز بیان میں الجھاو بالکل نہیں ہے۔ حسن انشا کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ نیچے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں۔

"این دریوزہ گر فیض الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نکشودہ و نامۂ خود بستایش دولتمندی سیاہ نمودہ۔"[3]

"ہر چند با احرار مباطا دارم و بارؤسا اختلاط اما سررشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بہ در غنا نریختہ۔ بلی، عندلیب را از مصاحبت گل زری و ماہی را از مجالست صدف گوہری مطمح نظر نمی باشد و درین معنی زمزمہ می سنجم۔

جابم مشت من از گوہر منت تہی آمد بنا شد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[4]

(انوری) "مگر تحصیل برہبتہ سرمایۂ علوم اندوخت اما وری از رفاہ بر روی روزگار نکشود۔ خریداری متاع سخن از ارباب دول دیدہ در شیوۂ شاعری افتاد و قصیدۂ نظم آوردہ از نظر سلطان سنجر سلجوقی گذرانید۔ . . . سلطان سخن شناس مستحسن داشت و برائے او مشاہرہ و ادراری معین فرمود۔ رفتہ رفتہ کار انوری خیلی بالا گرفت۔"[5]

لیکن آزاد نے ایسے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کیے ہیں، جنھیں اہل ایران کو

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۳۰۰ [2] مردم دیدہ، ص ۱۵، [3] خزانۂ عامرہ، ص ۳ [4] ایضاً، ص ۸ [5] ایضاً، ص ۸

قبول کرنے میں تامل ہوگا۔ مثلاً

"از مردم آن شہر بہ سلوکی بسیار معائنہ کرد۔"[1]

"این اشعار برائے معلوم کردن علو مرتبۂ مسعود در انشائے شعر عربی کفایاست۔"[2]

"نکہت خلقش دماغ را شگفتگی آورد۔"

"با سلطان عہد کردہ بود کہ مادام الحیوٰۃ در گفتن تتمہ بہمن نامہ خود را معاف دارد۔"[3]

". . . . از ملک سند علاقہ بالکل منقطع گردید۔"[4]

اسی طرح دولتمند امیر کے معنی میں، طبیعت مزاج کے معنی میں، خواہ مخواہ بجائے خواہی نخواہی، صلات گراں مند وغیرہ صحیح نہیں ہیں۔

خزانۂ عامرہ ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا شعراء کا تذکرہ ہے اور مستند حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں جو تاریخی واقعات، ادبی نکات، اشعار کی تشریح وغیرہ پائی جاتی ہے۔ اس نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۸۔ [2] ایضاً ص ۱۶ [3] ایضاً، ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۹۶

سعید نفیسی کے چند تسامحات

(سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف جون ۶۶ء)

(۳)

از ڈاکٹر (مسز ام ہانی) فخر الزماں صاحبہ ریڈر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۵۴) مغزانی چنبک (نفیسی ج ۱ ص ۵۱۱) نفیسی صاحب نے اس کی تاریخ وفات نہیں دی، جو خلاصۃ الاشعار میں موجود ہے، "شہور سنہ نہصد وشصت"۔

۵۵) احمد قتائی خلخالی، (نفیسی جلد ۲ ص ۸۳۸) "درگذشتہ در ۹۸۵ بودہ است"۔

نفائس المآثر (برگ ۱۱۴ (ب) رام پور) مولانا بست وہشتم رمضان سنہ خمس وسبعین وتسعمائۃ در قزوین بعالم بقا انتقال نمودہ"

۵۶۔ شیخ ابوالواجد فارغی خوافی (نفیسی ج ۱ ص ۶۱۵) نفیسی صاحب نے وفات کا ذکر نہیں کیا،

نفائس المآثر (برگ ۴۴ (الف) علی گڑھ) وفاتش در حدود سنہ اربعین وتسعمائۃ در آگرہ بودہ۔ قبرش در خانقاہ شیخ زین است و آن محل ظاہر و مشہور است"۔

۵۷۔ فہمی قزوینی (نفیسی ج ۱ ص ۶۵۷) در ۹۹۹ درگذشتہ"

نفائس المآثر (برگ ۱۴۶ (الف) علی گڑھ) وفاتش در قزوین در سنہ

تسع وسبعین وتسعمائۃ وقوع یافتہ"۔

۵۸۔ نثائی چغتائی (نفیسی ج ۱ ص ۳۰۔۴۲) نفیسی صاحب نے اس کے دیوانے ہونے کا ذکر کیا ہے، نفائس المآثر نے اس کا سنہ بھی لکھا ہے"،

نفائس المآثر (برگ ۸۴ (ب) علی گڑھ) "در شہور سنہ ثمان وسبعین وتسعمائۃ کہ بندگان حضرت اعلیٰ (اکبر) در ناگور نزول اجلال فرمودہ بودند، در روز کوچ از آنجا شاہ نثائی را دست جنون گریبان اختیارش گرفتہ بطرفی برد"

۵۹۔ فیروزہ کابلی (نفیسی ج ۱ ص ۱۵۵) نفیسی صاحب نے اس کے متعلق کوئی تاریخ نہیں لکھی،

نفائس المآثر (برگ ۱۵۳ (الف) علی گڑھ) دریں ولا کہ سنہ اثنی وثمانین وتسعمائۃ است از کابل روی بدرگاہ جہان پناہ (اکبر) آوردہ"

۶۰۔ کافی اردوبادی (نفیسی ج ۱ ص ۶۵۷) "از ندیمان دربار شاہ طہماسپ و غزلسرا بودہ"

نفائس المآثر (برگ ۱۶۶ (الف) علی گڑھ) "مکاتبات او کہ از جانب شاہ طہماسپ بحضرت خواندکار بادشاہ روم در وقت آمدن سلطان بایزید بعراق نوشتہ اند تمامی از نتائج طبع وقاد اوست کہ در عالم اشتہار دارد .... در بست وہفتم ذیقعدہ سنہ تسع وستین وتسعمائۃ در قزوین وفات نمودہ نعش او را بمشہد رضوی بردند"

۶۱۔ کلامی (نفیسی ج ۱ ص ۶۴۶) بدکن رفتہ و در آنجا ساکن شدہ"

نفائس المآثر (برگ ۱۶۸ (الف) علی گڑھ) مدتے در دکن بودہ از سلاطین آنجا مراعات یافتہ وبعضی اوقات در سلک ارباب شرع شریف سلسلۂ لطیف مندرج بود۔ در شہور سنہ سبع وسبعین وتسعمائۃ ازین ملک رفت"

۶۲- سید نجم الدین ابو القاسم محمد میانکالی معروف بملا قاسم کاہی (نفیسی ج ۱ ص ۱۵۱)

"در آگرہ در ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ در گذشتہ است"

(نفیسی ج ۲ ص ۸۱۹) "در دربار اکبر تہمت ملک الشعرائی یافتہ و یکبار ہزار تنکہ

صلۂ غزل باو دادہ است، وفاتش را در ۹۸۳ و ۹۸۸ نیز ضبط کردہ اند"

قاسم کاہی کی وفات کی خبر صرف دو بار (دروغ و راست) ہمعصر ماخذوں سے

ملتی ہے، مگر ہر صاحب ماخذ نے دروغ کی حقیقت واضح کر دی ہے، ہادی حسن صاحب

نے ہو تو اقبل ان تموتو اکہکر حسن تعلیل کر دیا ہے،

نفیسی صاحب نے اس دروغ کے علاوہ دو اور غلط تاریخیں پیش کر دی ہیں، اس کا

جواز مشکل ہے، صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ "قاسم کاہی" کے تین ہمعصروں نے مادہائے تاریخی

کہے تھے جن میں سے ہر ایک کے اعداد ۹۸۸ نکلتے ہیں:-

۱- از مولانا ابو القاسم بخاری شاگرد ملا قاسم کاہی "رفت ملا قاسم کاہی (ہفت اقلیم)

۲- از مولانا عارفی خلف مبارک "ز جہاں رفتہ قاسم کاہی، (ہفت اقلیم)

۳- فیضی (ملک الشعراء) دویم از ماہ ربیع الثانی" (دیوان فیضی)

دوسرا نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ ایک غزل پر نہیں، بلکہ قصیدہ لازم فیل پر اکبر نے قاسم

کاہی کو ایک لاکھ تنکہ انعام دیا تھا، اس قصیدے کے دو اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

تا بفیلان نیل دیدم دلستان خویش را، صرف راہ فیل کردم نقد جان خویش را

قاسم کاہی بپاے فیل آں شہ رخ نہاد باخت آخر در بساطش خانمان خویش را

ہفت اقلیم (برگ ۵۰۲ (ب) انڈیا آفس)

"بواسطہ قصیدہ لازم فیلے کہ گفتہ بود یک لک تنکہ صلہ گرفت"

قاسم کاہی کی وفات کے صرف ۴ سال بعد کی ہے، ہے،

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مغل پوئٹری: اٹس کلچرل اینڈ ہسٹاریکل ویلیو"

(ہادی حسن)

۶۳- مقیمی سبزواری (نفیسی ج ۱ ص ۳۵۵) چنان می نماید کہ نامش محمد مقیم بودہ باشد

زیرا کہ در شعر گاہی مقیم و گاہی مقیمی تخلص کردہ، بعد از فتح گجرات با یران باز گشتہ"

نفیسی صاحب نے محض اس لئے کہ وہ اشعار میں کبھی مقیم اور کبھی مقیمی تخلص کرتا تھا اس کا نام

طے کر لیا کہ محمد مقیم تھا (مقیم احمد اور مقیم الدین کیوں نہیں ہو سکتا ہے؟)

نفائس المآثر (برگ ۱۷۹ (الف) علی گڑھ) در شہور اربع و ثمانین و تسعمایۃ ......

مرزا مقیم با چند امیر دیگر از گجرات بکومک این لشکر آمدند این واکس در عرض سہ ماہ لشکر بسیار

جمع ساختہ آمادۂ جنگ گشت .... در صباح روز یکشنبہ چہارم ماہ ذی الحجہ ایلغار بردہ جنگ

عظیم واقع شد، کفار کشتہ شدند و فتح خوب واقع شد، اما میرزا مقیم کہ سردار ہراول بود

بدرجۂ شہادت فائز گشت"

۶۴- خواجہ حسین مروزی (نفیسی ج ۱ ص ۴۰۱) .... "در دربار اکبر مقام بلندی داشت"

قصیدہ اے ساختہ کہ از ہر بیت آن نام سلطان سلیم و تاریخ ولادت او کہ ۹۷۷ باشد بر می

میآید و قصیدہ دیگر دارد کہ از ہر بیت آن نام شاہ مراد و تاریخ ولادت او ۹۷۸ بیرون

میآید، سرانجام در سال ۹۷۶ از اکبر اجازہ گرفت و بکابل رفت، اند کے پس از ان در

کابل در گذشت"

نفیسی ج ۲ ص ۸۱۹) سال در گذشتش را برخی ۹۷۹ و برخی ۹۹۹ نوشتہ اند، و

این روایت دوم درست نمی نماید"

ابھی تک نہ ان اوصاف کا ہم نے کوئی مروی کا قصیدہ سنا اور نہ کسی ایسے سلطان سلیم اور شاہ مراد کا نام۔ البتہ مروی نے اکتیس اشعار کا ایک قصیدہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی ولادت کے موقع پر کہا تھا جس کے ہر پہلے مصرع سے اکبر کی تخت نشینی کا سنہ ۹۶۳ھ (ثلث وستین وتسعماۃ) اور ہر دوسرے مصرع سے شہزادہ سلیم کی ولادت کا سنہ ۹۷۷ھ (سبعین و سبعین وتسعمایۃ) نکلتا ہے، جیسا کہ خود مروی نے اظہار کیا ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۸۱ (الف) علی گڑھ) منتخب التواریخ (ج ۲ ص ۱۲۰-۱۲۳)
برائے تصحیح و تفصیل ملاحظہ ہو مغل پوئٹری ص ۵۲ تا ۵۴)

مصرع اوّل زدی سال جلوس بادشاہ	از دویم مولود نور دیدۂ عالم برآر
(= ۹۶۳)	(= ۹۷۷)

پہلا شعر اس قصیدہ کا یہ ہے:-

للہ الحمد از پی جاہ و جلال شہریار	گوہر مجد از محیط عدل آمد در کنار
(۹۶۳)	(۹۷۷)

مندرجہ بالا ماخذ سے رجوع کرنے پر یہ بھی معلوم ہو جائے گا، کہ اکتیس اشعار میں سے ایک میں بھی سلطان سلیم، کا نام نہیں ہے، اور نفیسی صاحب کے بیان کا یہ جز بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔

اس قصیدے کا ایک اور شعر لکھنا ضروری ہوا، اسلئے کہ نفیسی صاحب نے زیر بحث شاعر کا تخلص نہیں لکھا یا غلط لکھا حالانکہ شاعر کا تخلص اسکے نام سے زیادہ اہم ہوتا ہے، شہر مرو، کی نسبت سے مروزی اور مروی دونوں درست ہیں لیکن شاعر نے اپنا تخلص مروی ہی رکھا تھا، جیسا کہ حسب ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے،

یک بیک ابیات مروی بنگر بے عیب بہ	ہر یکے جوے زدی مقصود ہی دریابی دوبار
(۹۶۳)	(۹۷۷)

نہ صرف مروی کی زندگی میں بلکہ دربار اکبری میں اس قصیدے کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ دوسرا انعامی قصیدہ تھا جس پر اکبر نے گرانبہا انعام دیا، اور بداونی کے بیان کے مطابق

"دو لک تنکہ صلہ گرفت"

نفائس المآثر و منتخب التواریخ کے متفقہ بیان اور مغل پوئٹری کی تصحیح کے مطابق مروی نے کچھ اشعار اور بھی کہے تھے، جن میں سے ہر ایک کے پہلے مصرع سے سلیم کی تاریخ ولادت اور ہر دوسرے مصرع سے مراد کی تاریخ ولادت ۹۷۸ (ثمان وسبعین وتسعمایۃ) نکلتی ہے، اس کا بھی ایک شعر ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

داد دو شہزادہ بشاہ این سپہر	چہرۂ آن ہر دو بہ از آفتاب
(= ۹۷۷)	(= ۹۷۸)

مروی کے کابل جانے کا سنہ بھی نفائس المآثر اور منتخب التواریخ دونوں میں موجود ہے، لیکن آخر الذکر کے بیان میں تھوڑی سی الجھن پیدا ہو گئی ہے، اس لئے کہ

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۱۷۸) "او در سنہ نہصد و ہفتاد و نہ (۹۷۹) از ہندوستان رخصت وطن حاصل کرد، شیخ فیضی کہ تربیت یافتہ، او بود "دام ظلہ" تاریخ یافت اس کے اعداد ۹۸۰ آتے ہیں، اور یہی (یعنی ۹۸۰) ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ نفائس المآثر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، اگر ۹۷۹ مطلوب ہوتا تو "دام ظلہ" کہا جاتا،

وفات کے متعلق نفیسی صاحب نے دو سنہ لکھدئے ہیں یا کہیں سے نقل کئے ہیں تعجب ہوتا ہے کہ ۹۷۹ کو قبول اور ۹۹۹ کو رد کرتے ہوئے انھوں نے ایک لمحہ بھی اس پر غور نہیں کیا، کہ جو شخص ۹۷۹ یعنی پانچ سال پہلے مرچکا ہو، وہ ۹۸۴ میں شاہ مراد کی ولادت کا

قصیدہ کیونکر کہہ سکتا ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۸۱ (الف) علی گڑھ)

خواجہ حسین مروی در تاریخ سنہ ۹۸۴ھ اربع و ثمانین و تسعمایۃ بعلت بواسیر طعمۂ اجل شد"

۶۵- محمود مسی محوی (جلد ۱ ص ۲۲۴ و جلد ۲ ص ۸۴۳) وطن، تاریخ ولادت، خاندان، مدت ملازمت اور تاریخ وفات نہیں دی گئی، جو نفائس المآثر میں موجود ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۸۴ (ب) علی گڑھ) "اصلش از گنج از نواحی تبریز است محمدی بیگ کہ میر انشائے شاہ طہماسپ است، واستعداد تمام دارد از عشائر اوست، میر محمود بیست و پنج سال است، کہ دریں دولت ابدی الاتصال میر انشائے باستقلال است، ولادتش در شہور سنہ ثمان وعشرین و تسعمایۃ بودہ،........ وفاتش در قلعہ سورت بیوم شہر ذیقعدہ سنہ ثمانین و تسعمایۃ واقع شدہ"

۶۶- میلی ہروی (ج ۱ ص ۲۱۴) نفیسی صاحب نے سنہ وفات نہیں دیا،

خلاصۃ الاشعار :- "ثلاث و ثمانین و تسعمایۃ")

۶۷- شفقی بخارائی (ج ۱ ص ۵۶۸ و ج ۲ ص ۸۳۶) نفیسی صاحب نے اس کے صرف ایک بار ہندوستان آنے کا ذکر کیا ہے،

منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۲۲۸، ۲۲۹) دو مرتبہ در ہندوستان در آمدہ و رفت اسپرنگر نے بھی اس کی تائید کی ہے،

۶۸- نیکی اصفہانی (نفیسی (ج ۲ ص ۸۳۲)

"در رمضان سال ہزار........ در گذشتہ"

عرفاتِ عاشقین : در تاریخ وفات قائل عرفات، ایں رباعی کہ در مرقدش نوشتہ بنظم آوردہ،

نیکی کہ بد از جملۂ نیکان زماں	مرکز شدہ در دائرۂ کون و مکاں
تاریخ شدش ز بعد رفتن زمیاں	"نیکی زجہاں رفت نیکی ز جہاں"

(۹۹۲)

۶۹- نثاری دہلوی (ج ۲ ص ۸۳۵) "تاریخ در گذشت وے را باختلاف ۱۰۱۸، و ۱۰۲۰ و ۱۰۲۵ نوشتہ اند"

تزک جہانگیری ص ۸۱-۸۲) در جشن پنجمیں نوروز جہانگیری (سنہ یکہزار و نوزدہ ہجری) در گذشت" جہانگیر کے سامنے بھرے دربار محفلِ سماع میں اس کا انتقال ہوا تھا، لہذا اس میں خود جہانگیر نے پوری تفصیل لکھی ہے،

۷۰- خواجہ بہار الدین سید حسین تجاری متخلص بہ بنثاری (ج ۱ ص ۴۰۳)

"در ۹۸۳ تذکرہ اے شعرائے فارسی زبان تا عصر خود بنام مذکر احباب تالیف کردہ است"

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی نے "کتاب خانہ حبیب گنج کی فہرست کے سلسلے میں (فکر و نظر جنوری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۴) میں اس کے نسخے کا تعارف کرایا تھا، اور موصوف کی فرمائش پر خاکسار نے "معارف" ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۰۵ - ۲۲۵) "مذکر احباب کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایک مقالہ ہدیۂ ناظرین کیا تھا،

"در ۹۸۳ھ" سے بات کا سر پیر نہیں معلوم ہوتا، یہ آغاز کی تاریخ ہے، یا انجام کی؟ یا صرف سال بھر میں اس نے تذکرہ لکھ لیا، مگر وہ تو یہ بھی کہتے ہیں "تا عصر خود" تو وہ کیا تھا؟

اس کا زمانہ کب تک قائم رہا، نفیسی صاحب نے آسان سی بات سوچ لی کہ تادمِ آخر وہ تذکرہ لکھتا رہا ہوگا،

تذکرِ احباب:۔

چوں دریں تذکرہ زبانِ قلم	ذکرِ احباب کرد از ہر باب
تمام و تاریخ سالِ اتمامش	گشت ازاں رو "تذکرِ احباب" (=۹۷۴)

تذکرِ احباب کا تنقیدی جائزہ: "لیکن متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سنہ یعنی ۹۷۴ھ کے بہت بعد تک اضافے کا کام جاری رہا" چنانچہ اس نے خواجہ حسین مروی کے حج سے واپس آنے کا تذکرہ کیا ہے جو ۹۸۰ھ میں واقع ہوا تھا، مگر ۹۸۳ کی کوئی تاریخ نہیں ملی،

نثاری کا نام:

تذکرِ احباب: بعد از تولّد حضرت ملا اصفہانی کہ از اکابرِ علماء و محدثین بود تہنیت آمدہ اند، نفیر را والد این کمینہ نزدِ ایشاں آوردہ نامِ نفیر را بہاء الدین حسن گذاشتہ اند و ایں قطعہ را گفتہ بدیہ شریف نوشتہ اند،

خواجہ حسن نقدِ دل بادشاہ	خواجہ بہاء الدّین کنمش نام
تا ثانی او خواجۂ ابرار باد	انبتہ اللہ نباتا حسن"

۷۱- مولانا محمد شریف وقوعی تبریزی (نفیسی ج ا ص ۵۱۳) "در ۱۰۱۸ درگذشتہ است،

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۳۷۸ - ۳۸۱) وفات شریف وقوعی در ہزار و دو (۱۰۰۲) بود"

......ە.ە.ە.ە......

وفیات

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق تحقیق دار المصنفین اعظم گڈھ

اہلِ علم و اصحابِ نظر ابھی مولانا عبد الباری ندوی مرحوم کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے،

مولانا مرحوم کا خاندان نگرام ضلع لکھنؤ میں صدیوں سے آباد اور اپنی علمی و دینی خدمات کے لحاظ سے قرب و جوار میں ممتاز تھا، مولانا مرحوم کے پردادا مولانا حافظ عبد العلی نگرامی ایک نامور عالم تھے، مشہور نقشبندی بزرگ قاضی عبد الکریم نگرامی سے بیعت اور صاحبِ اجازت تھے، یہ قاضی عبد الکریم اپنے ہمنام قاضی عبد الکریم جد اسی کے خلیفہ تھے، جو حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے صاحبزادہ سید محمد کے مرید اور سید محمد عدل کے تربیت یافتہ تھے، اس کے علاوہ مولانا عبد العلی کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجے خواجہ احمد نصیر آبادیؒ سے بھی اجازت حاصل تھی، ان بزرگوں کے اثر نے ان کے اندر توحید کا جوش اور سنت کا غیر معمولی ولولہ پیدا کر دیا تھا، وہ گانوں گانوں پھر کر دینِ حق کی منادی کرتے تھے، اس زمانہ میں شرک و بدعات اور غیر شرعی رسوم کا جال ہر جگہ پھیلا ہوا تھا، مولانا عبد العلی کے پُر تاثیر مواعظ اور دلنشین اندازِ بیان سے بکثرت لوگ تائب ہوئے اور شیخ سدو کے بکرو اور ہٹیلے کے مرغوں کو چھوڑ کر اور میلے ٹھیلوں کو ترک کر کے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری میں لگ گئے،

حافظ عبد الغنی کے بیٹے اور مولانا مرحوم کے دادا مولانا محمد اویس صاحب بھی اپنے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں بہت ممتاز تھے، اپنے والد کے علاوہ انھوں نے مولانا عبد الحی فرنگی محلی، مولانا عبد الرحمٰن پانی پتی، شیخ عبد الحق صاحب تفسیر حقانی سے بھی اکتساب علم کیا، علوم باطنی میں توجہ شیخ وقت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کی پائی، ان سے خلافت عطا ہوئی، اور اس طرح علوم ظاہری و باطنی میں بڑا مقام پیدا کیا، مولانا مرحوم کے والد مولانا محمد انیس نگرامی بھی ایک معروف عالم تھے اور اودھ کے قصبات و دیہات میں ان کے تبلیغی و اصلاحی دورے ہوتے رہتے تھے،

اس طرح مولانا مرحوم کو ظاہری و باطنی علوم وراثت میں ملے اور قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پڑیں، آگے چل کر انھوں نے اس بیش قیمت ورثہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور بزرگوں کے نام اور کام کو دور دور تک پھیلا دیا۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے بزرگوں کے زیر سایہ حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، ۳۲ء میں تعلیم مکمل کی، بیعت اپنے والد سے ہو چکے تھے لیکن بعد میں مولانا حسین احمد مدنی سے بھی اجازت حاصل کی اور ان کی مجلس درس سے مستفید بھی ہوئے، مولانا مدنی کے اثر سے ان کے سیاسی شعور میں بھی پختگی آئی اور جرأت و حق گوئی کی عادت پڑی، ذہنی تثقیف و تہذیب کے لیے خود دار العلوم کی فضا اور ماحول ہی کیا کم تھا، مزید یہ کہ استفادہ کا موقع مولانا سید سلیمان ندوی جیسے یگانۂ روزگار سے ملا جن کی نگاہ ہی میں مس خام کو کندن بنا دینے کی صلاحیت تھی، ان کی نگاہ جوہر شناس پہلی نظر میں ذہانت و صلاحیت کو بھانپ لیتی تھی، چنانچہ سید صاحب نے ان کو اپنی خاص تربیت میں لے لیا اور دار المصنفین بلا لیا، یہیں سے مولانا مرحوم کی علمی و دینی شہرت کا آغاز ہوا، معارف میں ان کے مقالات و مضامین، اہل علم کی توجہ کا مرکز بنے، طبیعت کا میلان قرآنی علوم کی جانب شروع ہی سے تھا، چنانچہ اکثر مقالات

قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے متعلق تھے، تراجم قرآن، زندیق کی حقیقت، حافظ جلال الدین سیوطی، کلمۃ اللہ، ابن جریر طبری، مستشرق نولدیکی اور قرآن، امام ابو الحسن اشعری، کچھ تفسیر رازی کے متعلق، حجر اسود وغیرہ مضامین ان کے اس ذوق و شوق کے شاہد عادل ہیں، سید صاحب کی تربیت و نگرانی میں انھوں نے اس فن میں نمایاں ترقی اور بڑی دسترس حاصل کر لی، تفسیر ابن القیم ان کی تلاش و محنت کا ایسا شاہکار ہے جس نے دینی و علمی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، عرب سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، سات سال تک دار المصنفین میں تصنیف و تالیف کی مشق و مہارت کے بعد مولانا مرحوم نے ندوہ کی ضرورت کے پیش نظر سید صاحب کی مرضی و مشورہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر کی ذمہ داری قبول کی اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے، ندوہ کی ملازمت کے زمانہ میں بعض یونیورسٹیوں سے بیش قرار معاوضہ کی پیشکش ہوئی مگر وہ ندوہ چھوڑ کر کہیں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے، سینکڑوں طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا، درس قرآن میں شرکت، طلبہ کی آرزو اور وجہ سعادت بن گئی، قرآن کی سی معجزانہ کتاب، بلاغت و فصاحت کا بلند ترین معیار اور پھر مولانا مرحوم کا والہانہ انداز گفتار، مفسرین کے اقوال و افکار، صوفیہ کے رموز و اسرار، درمیان میں سید صاحب کے ذکر کی تکرار، درس قرآن کو گل افشانی گفتار کا عجیب نمونہ بنا دیتے، سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کبھی کبھی کئی کئی روز تقریر جاری رہتی، تفسیر ماجدی کا ذکر تحسین کے ساتھ اکثر کیا کرتے، طلبہ کو اس کے مطالعہ کا مشورہ بھی دیتے، تفسیر میں صرف و نحو کی بحثیں بھی ہوتیں، فصاحت و بلاغت کے مسائل بھی چھڑتے، عقائد و کلام کے مباحث بھی ہوتے، مگر ان چیزوں میں الجھ کر نہ رہ جاتے بلکہ قرآن کی دعوت اور اس کے مقاصد ہر موقع پر پیش نظر رکھتے، مفسرین کے حوالے دیتے، ان کے اقوال تائید میں نقل کرتے اور طلبہ کے لیے کسی گوشہ کو تشنہ نہ چھوڑتے، دوران درس آپ بیتی

اور جگ بیتی کے پر لطف واقعات سنا کر خود محظوظ ہوتے، طلبہ کو بھی اس حظ میں شریک کرتے، سید صاحب کے ذکر کے وقت ان پر بے خودی و سرمستی کی عجیب کیفیت طاری ہوتی، مزے لے لیکر ان کے واقعات بیان کرتے، آج بھی کانوں میں ان کی یہ صدا گونج رہی ہے کہ "ہمارے سید صاحب یہ فرمایا کرتے تھے"

وسیع النظر، وسیع القلب تو تھے ہی وسیع المشرب بھی تھے، تقلید جامد خود کیا کرتے دوسروں سے بھی اس کی توقع نہ رکھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس وسیع المشربی میں بڑا حصہ تعلیمات قرآن ہی کی دین تھا، ندوہ کے مقاصد سے انھیں صرف قول ہی کی حد تک اتفاق نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ ندوہ کے مقاصد کی سچی تصویر تھے، ندوہ کا ماحول اور سید صاحب کی توجہ نے ان کی فکر کو جلا بخشی تھی، ذہن میں ایسی درخشانی، عمل میں ایسی تابانی اور مزاج میں ایسی شگفتگی تھی کہ کیا دوست احباب، کیا تلامذہ و عقیدتمند، سب کے سب ان سے کسب فیض کرتے، حق یہ ہے کہ ان کی ذات ندوہ کی اساس پر بڑی خوبصورت اور بڑی دلکش عمارت تھی، جس میں قدیم علم و تمدن اور عہد جدید کی بیداری و تازگی دونوں شامل تھیں اور یہی وہ حسن توازن تھا جس نے ان کی شخصیت کو جدید و قدیم کا مرجع بنا دیا تھا، پرانے دیندار بھی ان سے خوش تھے اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان کے گرویدہ تھے، ندوہ کا مقصد بھی یہی تھا اور ندوہ کے اس عظیم فرزند کا مشن بھی یہی، کتنے ذہن تھے جو بہک سکتے تھے مگر مولانا مرحوم کے درس قرآن نے ان کو ایمان و یقین کی ایسی مستحکم چٹان بنا دیا تھا جن کو کفر و الحاد کی تیز و تند آندھیاں بھی جنبش نہ دے سکیں۔

مولانا مرحوم کی تقریر و تحریر میں نمایاں چیز شگفتگی تھی، تفسیر تو خیر لیکن کلامی مسائل میں زبان شستہ و شگفتہ رہے یہ ذرا مشکل ہے لیکن شاید یہ اودھ کے قصباتی اور

ندوہ کے ادبی رنگ کی برکت تھی کہ ایسے مواقع پر بھی زبان بڑی دلکش اور مؤثر ہوتی تقریریں عموماً کم کرتے لیکن جب کرتے تو دلوں پر گہرا اثر چھوڑتے، ندوہ کی مسجد کے توسیعی مرحلہ پر انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ ابتک ذہن پر نقش ہے، اسی طرح تعزیتی جلسوں اور طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح کی محفلوں میں انکی تقریریں سننے کے لائق ہوا کرتی تھیں، بڑے خوش وضع خوش لباس اور خوش گفتار تھے، ہم طلبہ میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا باہمہ ہوں یا بے ہمہ، پان کی نفیس ڈبیا، خوبصورت منقش چھڑی اور لازوال تبسم کبھی ان سے جدا نہیں ہوتے، طلبہ انھیں دار العلوم کی آبرو اور ماضی کی عظمت کا امین سمجھتے تھے اور اس احساس میں وہ غلط بھی نہ تھے،

ندوہ سے ان کے عشق کا حال یہ تھا کہ جشن کے موقع پر ان کی علالت تشویش ناک ہو چلی تھی، مرض کی شدت نے ضعف و نقاہت میں بھی تیزی پیدا کر دی تھی، اس کے باوجود ان سے رہا نہ گیا اور معالجوں کی ممانعت کے باوجود ایک کار میں بیٹھکر انھوں نے دار العلوم کے پورے کیمپس کا دورہ کیا، پنڈال اور اسٹیج دیکھا، عمارتوں اور پارکوں پر نظر ڈالی، در و دیوار بلکہ ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھا، در و دیوار پر سبزہ اگ رہا تھا، اس جوشش فصل بہاری میں انھیں غالب کی طرح اپنے بیابانی ہونے کا تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا، یہ دورہ دار العلوم کا شاید آخری دورہ تھا، زبان قال سے نہ سہی زبان حال سے وہ چمن والوں کو خوش رہنے اور اپنے آخری سفر پر چلنے کی بات کہہ گئے تھے، ممکن ہے آنسو پلکوں تک آئے ہوں لیکن مانوس تبسم اب بھی ان کے ساتھ تھا، یہ تبسم مجھے اس وقت بھی ان سے جدا نہ دکھائی دیا جب میں آخری بار ان کی عیادت کی غرض سے لکھنؤ میڈیکل کالج پہنچا تھا، بھاری بھرکم جسم اب نحیف و نزار ہو چکا تھا، دل کے مرض نے حالت اس حد تک پہنچا دی تھی، بے اختیار

یہ شعر زبان پر آگیا ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہو

مگر اس کے باوجود دیر تک نصیحتیں کرتے رہے، جب معلوم ہوا کہ میں دارالمصنفین جارہا ہوں تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور پھر خاموش ہوگئے، شاید عہد رفتہ کی کچھ کہانیاں یاد آگئی ہوں۔

مولانا مرحوم کی تصانیف کی فہرست زیادہ طویل نہیں، درس و تدریس کی زندگی اس کا موقع بھی کہاں دیتی تھی لیکن اس کے باوجود تفسیر ابن القیم ہی ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے، فکر و خیال کی ہم آہنگی نے انھیں شاہ ولی اللہ دہلوی کا بڑا معتقد بنا دیا تھا، چنانچہ علم کلام میں شاہ صاحب کے رسالہ العقیدۃ الحسنہ کی شرح لکھی جو العقیدۃ السنیہ کے نام سے طبع ہوئی، یہ رسالہ نہ صرف ہندستان بلکہ عالم عربی کے مدارس میں داخل نصاب ہوا، اس کے علاوہ تعلیم القرآن، رسالہ اصول حدیث، قرآن کا مطالعہ کیسے اور بلاکشان اسلام جیسی تصانیف یادگار چھوڑیں، ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو، سید صاحب کے حوالوں اور حواشی کا ایک قابل قدر تفسیری سرمایہ ان کے پاس محفوظ تھا، اس کی اشاعت بھی قرآنی علوم میں قیمتی اضافہ ہوگی۔

زندگی ان کی قابل رشک رہی پھر موت کیوں نہ قابل رشک ہوتی، جمعہ کا دن ملا، شعبان و رمضان کے سے مبارک مہینوں کے عین اتصال کے موقع پر برکتوں کے سایہ میں وہ اپنے رب سے جا ملے، دیکھا تو نہیں لیکن یہ یقین ضرور ہے کہ اپنے خدا سے ملتے وقت بھی وہی لازوال تبسم ساتھ رہا ہوگا، جو خدا کے بندوں کے لیے دل کا آئینہ بنا ہوا تھا ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

ادبیات

غزل

از جناب طفیل احمد صاحب مدنی الہ آباد

شعور کیف غم جتنا ہی حاصل ہوتا جاتا ہے
مرا ذوق جنوں اتنا ہی کامل ہوتا جاتا ہے

نہ جانے کیا اثر پنہاں ہے ساقی کی نگاہوں میں
کہ جس جس پہ نظر پڑتی ہے بسمل ہوتا جاتا ہے

انھیں کی ذات تھی گویا ضمانت کیف ہستی کی
وہ کیا آئے دوبالا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے

طلب صادق ہو تو مطلوب آجاتا ہے خود کھنچ کر
ہو گر عزم سفر ہر گام منزل ہوتا جاتا ہے

رہ عشق و وفا میں گامزن ہوتے نہ ڈر ہمدم
سفر کا تجربہ منزل بہ منزل ہوتا جاتا ہے

طفیل اس کی توجہ کا اثر ناچیز پر یہ ہے
کہ ذرہ رفتہ رفتہ ماہ کامل ہوتا جاتا ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

وقت کے ساتھ ساتھ چل وقت کا اعتبار کر
جس سے ملے حیات نو راہ وہ اختیار کر

کارگہ جہاں سے دور دسترس خزاں سے دور
ایک نیا چمن بنا تکملۂ بہار کر

عشق کی اصطلاح میں زیست فنا کا نام ہے
زیست کا اعتبار کیا موت کا اعتبار کر

عقل ہی مصلحت نگر عقل ہی چارۂ خذر
دل کے معاملات میں عشق کا اعتبار کر

آتے ہی لب پہ میرے نام مل گئی راحت دوام
کوئی خموش ہوگیا آج انھیں پکار کر

اُس کی حریم ناز اگر تجھکو کبھی نصیب ہو
دیدہ و دل کا ذکر کیا جان کو بھی نثار کر

ایک ادائے خاص سے دل پہ گرا کے برقِ ناز
جو ہے بے قرار کو اور بھی بے قرار کر

غزل

از جناب عروج زیدی صاحب

روشنی شرطِ سفر ہو یہ ضروری تو نہیں
دن مری راہ گذر ہو، یہ ضروری تو نہیں

جستجو چاہے تو بچ کر بھی گزر سکتی ہے
ہر طرف گردِ سفر ہو، یہ ضروری تو نہیں

زندگی جس کا مہ و مہر بھی کرتے ہیں طواف
وہ نقط رقصِ شرر ہو یہ ضروری تو نہیں

اے کہ غائب ز نظر مرکزِ ایمان من است
تیرے جلووں پہ نظر ہو یہ ضروری تو نہیں

انقلاب سحر و شام کے زیرِ سایہ
غم ہی تقدیرِ بشر ہو یہ ضروری تو نہیں

میری آنکھوں میں تو ہر عکس اُبھر آتا ہے
وہ بھی آئینہ نظر ہو، یہ ضروری تو نہیں

نگہِ دیدطلب کی ہے الگ بات عروج
ہر نظر جانبِ در ہو، یہ ضروری تو نہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

نقوشِ اقبال ۔ ترجمہ مولوی شمس تبریز خانصاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۲۰ ۔ قیمت للعہ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عربی ممالک کو علامہ اقبال کے کلام و پیام سے واقف کرانے کے لئے "روائع اقبال" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اردو و انگریزی میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے، اردو کے پہلے اڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ ہو چکا ہے، اس دوسرے اڈیشن میں کئی اہم اضافوں کے علاوہ اردو کے نامور انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، فاضل مصنف اور ڈاکٹر اقبال میں بڑی فکری ہم آہنگی ہے، دونوں کا مقصد اسلام کی دعوت و اشاعت ملت اسلامیہ کی سربلندی اور دنیا کو یورپ کے مادی و لادینی نظام کی تباہیوں سے بچانا ہے اس لئے مصنف نے اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے کلام اور ان کی متعدد شاہکار نظموں کا خلاصہ کر کے دراصل اسلام کی اصل روح اور اس کی تعلیمات کا لب لباب پیش کر دیا ہے، ان کو قدرت نے اور کمالات کے علاوہ شعر و ادب کا بھی نہایت ستھرا ذوق اور بڑا موثر اور دلکش پیرایۂ بیان عطا کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ اور ساحرانہ

شاعری کی یہ پرسوز، پراثر اور پرکیف ترجمانی دیکھ کر بس یہی جی چاہتا ہے کہ ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

مخدوم علی ئمی ۔ مرتبہ مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۔۔ قیمت ۱۲ روپیہ نقش کوکن پبلی کیشنز ۴۴۔ جیل روڈ (ایسٹ) ڈونگری بمبئی۔

حضرت مخدوم علی مہائمی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے یہ کتاب ان جلیل القدر بزرگ کی سوانح عمری ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے، پہلے صاحب ترجمہ کے وطن "ماہم" کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور ان کے خاندان "نوایت" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے حالاتِ زندگی تعلیم و تربیت، اشغال و معمولات، وفات اور مزار کے متعلق معلومات درج ہیں۔ آخر میں ان کے علمی کمالات، تصنیفات اور افکار و نظریات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مخدوم صاحب تفسیر اور فلسفہ و تصوف میں بہت ممتاز تھے، لائق مصنف نے ان کی ان حیثیتوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، آٹھویں باب میں تفسیر مہائمی پر تبصرہ کرکے اس کی اہم خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ مخدوم صاحب قرآن مجید کو منظم و مربوط کلام سمجھتے تھے، نویں اور دسویں باب میں نظریۂ وحدت الوجود کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اس میں شیخ محی الدین اکبر اور وحدت الوجود کے بارہ میں علمائے اسلام کے مختلف خیالات ذکر کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے، اس ضمن میں حضرت شیخ مجدد کے وحدت الشہود کا بھی ذکر آگیا ہے، اور آخر میں مخدوم صاحب نے وحدۃ الوجود کی تشریح میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے، یہ بحث بڑی نازک ہے مگر مصنف نے اس پر معتدل انداز سے بحث کی ہے۔ البتہ انھوں نے مخدوم صاحب کی

بعض تصنیفات کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، اور حوالے میں قدیم ماخذ کے علاوہ بعد کی تصانیف سے بھی مدد لی ہے، فکر و خیال سے اختلاف اور معمولی فروگزاشتوں کے باوجود کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، ابھی تک غالباً اردو میں مخدوم علی مہائمی پر کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اس سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ اس میں مخدوم صاحب کی تحریر اور مقبرہ وغیرہ کے عکسی فوٹو بھی دے گئے ہیں۔

صنمکدۂ و سازِ بیخودی ۔ از جناب عمر انصاری صاحب متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت نفیس صفحات بالترتیب ۶۵۴ و ۲۲۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ و ۶ روپیہ۔ مکتبہ فردوس ادب امین آباد پارک ۲

جناب عمر انصاری اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم شاعری کی خصوصیات و اعلیٰ روایات کے ساتھ نئے اسلوب اور نئے افکار و خیالات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے "صنمکدہ" غزلوں کا مجموعہ ہے اس میں سنہ ۳۰ء سے سنہ ۶۳ء تک کی منتخب غزلیں شامل ہیں، مصنف نے حسن و عشق اور الفت و محبت کے لطیف جذبات کی مصوری اور زندگی کے حقائق و مسائل کی تلاش و جستجو بھی کی ہے اور موجودہ دور کے رجحانات و میلانات کی عکاسی بھی کی ہے، اور بقول ان کے "غزل ان کے دل کی آواز ہے"، نمونہ کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

یہ جنگ حسن و عشق بھی ہے کیا عجیب جنگ　　عمریں گذر گئیں نہ کوئی فیصلہ ہوا

اک تلاطم ہے کہ ہوتا ہی نہیں کم ورنہ　　چڑھ کے سنتے ہیں کہ دریا بھی اتر جاتا ہے

یہی نہیں کہ بس اک منظرِ تباہی ہوں　　میں اپنے عہد کی سرتاقدم گواہی ہوں

کیا چیز ہے نہ جانے یہ مجبوریٔ حیات　　کہتے ہوئے ملے مجھے کچھ لوگ دن کو رات

سازِ بیخودی نظموں اور رباعیات پر مشتمل ہے، نظمیں انصاری صاحب کی فکر کی جولان گاہ اور دردمند و اثر پذیر دل کی صدائے بازگشت ہیں، یہ مختلف واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں، ان میں اس عہد اور ماحول کی مرقع کشی کی گئی ہے، ان سے شاعر کے جوشِ طبع، قوتِ تخیل، شدتِ احساس اور دقتِ نظر و مشاہدہ کے علاوہ اس کی دردمندی، انسان دوستی اور حب الوطنی کا بھی پتہ چلتا ہے، دہر آشوب، بے رحم مہاجن سے خطاب، ہندوستانی کسان، نیچ ذات، گنگا کی بھینٹ اور فریاد میں موجودہ دور کی وحشت و بربریت اور سماجی و معاشی ناہمواری کا دلدوز منظر بیان کیا گیا ہے، جنت کشمیر، دھانی کھیت کی ایک شام، گومتی، روح کا خطاب، اصرار پیہم، عید ملن، یاد ایام، پپیہا اور شاعر اور نالۂ جرس وغیرہ بھی بڑی موثر اور کامیاب نظمیں ہیں، اور ان سے محاکات اور منظر نگاری میں مصنف کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں رباعیات کا حصہ ہے جنکو مصنف نے اپنی ذہنی آوارگی کا نتیجہ کہا ہے، اور جن کے بارہ میں انکا یہ بجا خیال ہے کہ "میں نے اس صنفِ سخن کو حکیمانہ بنانے سے زیادہ شاعرانہ بنانے کی سعیِ بلیغ کی ہے"، ہر صنفِ کلام سے شاعر کی زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت، فکر و خیال کی لطافت و بلندی، اسلوب و طرزِ ادا کی جدت و تازگی، تشبیہات و استعارات کی دلکشی و رعنائی اور کلام کے اثر و پختگی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ اس پُر کیف کلام سے ارباب ذوق لطف اندوز ہوں گے۔

سب کے نبیؐ۔ مرتبہ مولانا عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت ۳؎ پتہ۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج، جونپور،

مولانا عثمان احمد صاحب نے بچوں کے لیے سیرت طیبہ پر یہ مختصر کتاب سادہ اور آسان زبان میں لکھی ہے، بچوں کیلئے سیرت پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب کا طرز بیان دلچسپ ہے اور جابجا مناسب اشعار سے بھی مزین ہے، اس لیے امید ہے کہ بچے اسکو شوق سے پڑھیں گے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت سے سبق حاصل کریں گے۔　　"ض"

جلد ۱۱۹　ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ　عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات